Ripōrt tīsrī Kul-Hind Anjuman

رپوٹ

تیسری کُل ہِند انجمنِ ترقیٔ اُردو کانفرنس

منعقدہ ۱۹، ۲۰، ۲۱ جنوری بہ مقام ناگ پور

Anjuman Taraqqī-i Urdū (Hind), Dihli

مُرتّبہ

جناب محمد ابراہیم خاں صاحب

سکریٹری مجلسِ استقبالیہ

شائع کردہ

انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) دہلی

۱۹۴۴ء

تعداد ۱۰۰۰ پہلی بار

رپوٹ

تیسری کُل ہند انجمنِ ترقیٔ اُردو کانفرنس

منعقدہ ۱۹، ۲۰، ۲۱ جنوری بہ مقام ناگ پور

مُرتّبہ

جناب محمد ابراہیم خاں صاحب بی۔ اے

سکریٹری مجلسِ استقبالیہ

شائع کردہ

انجمنِ ترقیٔ اُردو (ہند) دہلی

سنہ ۱۹۴۴ء

فہرست

پیش لفظ

کبھی کبھی ایک واقعہ جو ابتدا میں بہ ظاہر معمولی اور غیر اہم سا نظر آتا ہی، بڑے دُور رس اثرات اور نتائج کا باعث بن جاتا ہی۔ اسی قسم کا ایک واقعہ یا حادثہ ۱۹۳۶ء میں ناگ پور میں رُونما ہوّا۔ ہماری مُراد "اکھل بھارتیہ ساہتیہ پرِشَد" کے اجلاس سے ہی، جس کی صدارت گاندھی جی نے فرمائی تھی۔

انجمنِ ترقی اُردؤ کا تیسرا کُل ہند اجلاس ۱۹، ۲۰، ۲۱ جنوری ۱۹۴۱ء کو ناگ پور میں منعقد ہوّا۔ کانفرنس کی رپوٹ پیش کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہو کہ اُن اسباب کا بھی جائزہ لیا جاتے جو اس کانفرنس کو وجود میں لانے کا باعث ہوتے۔ ان اسباب میں پہلا اور بڑا سبب "بھارتیہ ساہتیہ پرِشَد" کا وہی اجلاس ہی جس کا حوالہ اُوپر دیا جا چکا ہی۔ اسی اجلاس نے نواب محی الدین خاں صاحب ایم۔ ایل اے صدر استقبالیہ کُل ہند انجمنِ ترقیِ اُردؤ کانفرنس ناگ پور کے الفاظ میں "تاریخ لکھنے اور لکھانے والی انجمنِ ترقیِ اُردو کی تاریخ بدل دی اور اورنگ آباد کی محدود دنیا سے نکال کر دلّی کی راج دھانی میں لاکر اسے علم و ادب کی خدمت کا تاج پہنا دیا" ایک پُرانی اور مشہور مثل ہی کہ عوام کا حافظہ کم زور ہوّا کرتا ہی۔ نئے زمانے کے ہتھیاروں میں سے بڑا کام یاب اور مؤثر ہتھیار پروپگنڈے کا ہی۔

جن لوگوں کے پاس اِس کا اچھا ذریعہ ہی، وہ بڑی آسانی سے جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنا سکتے ہیں یا پربت کو رائی اور رائی کو پربت ثابت کر سکتے ہیں۔ ہندُستان کی موجودہ تاریخ میں سیاسی ہو یا تمدنی، علمی ہو یا ادبی زبان کے نزاع کو بڑا دخل ہی اور یہ بھی واقعہ ہی کہ اِس نزاع کو بہت بڑی تقویت "بھارتیہ ساہتیہ پرشد" کے اجلاس ناگ پور سے پہنچی۔ صرف اس خیال سے کہ زبان کے متعلق انجمنِ ترقیٔ اُردو (ہند) کی پوزیشن ایک بار پھر صاف ہو جائے اور آنے والے مورخ کے لیے ایک ایسی دستاویز فراہم ہو جائے جس کی روشنی میں وہ کسی صحیح فیصلے پر پہنچ سکے، ذیل میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمنِ ترقیٔ اُردو (ہند) کا وہ مضمون درج کیا جاتا ہی جو آپ نے اس اجلاس میں شریک ہونے کے بعد اس سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔

بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی اصل حقیقت

بہت سے اصحاب اس جُملے کے معنی نہیں سمجھیں گے اور اِس عنوان کو پڑھ کر انھیں الجھن ہوگی۔ اس لیے سب سے اوّل یہ بتا دینا ضروری ہی کہ اِس کے معنی ہیں "ہندستان بھر کی ادبیات کی انجمن" اس کا پہلا اجلاس ۲۴ اور ۲۵ اپریل کو ناگ پور میں ہوا۔ مہاتما گاندھی اس کے صدر تھے۔ اِنھی تاریخوں میں "ہندی ساہتیہ سمیلن کے اجلاس بھی مختلف اوقات میں وہیں ہوئے۔ اس کے صدر بابو راجندر پرشاد تھے۔ اس سے قبل کہ ئیں پرشد کے اس اجلاس کے حالات بیان کروں، یہ ضروری معلوم ہوتا ہی کہ پہلے اس کی "شانِ نزول" سے مختصر طور پر بحث کروں۔ یعنی یہ کہ یہ انجمن

کن وجوہ سے وجود میں آئی اس کا اصل مقصد کیا ہی۔ جب تک یہ نہ کیا جائے گا
اس کی پوری حقیقت سمجھ میں نہ آئے گی۔ مسٹر کاکا کالیلکر اِس اجلاس کی
مجلسِ استقبالیہ کے صدر تھے۔ انھوں نے اپنے اڈریس میں بھارتیہ ساہتیہ
پرِشد کی پیدایش کا حال کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہی ٹیں اُسی کا
خلاصہ یہاں لکھتا ہوں کیوں کہ ان کا بیان زیادہ مستند سمجھا جائے گا۔ وہ
فرماتے ہیں کہ ۱۹۱۹ء میں مہاراشٹر ساہتیہ سمیلن منعقدہ بڑودہ میں سب سے
پہلے یہ خیال پیدا ہوا۔ اُس کے بعد کولھاپور کے اجلاس میں مہاراجا بڑودہ
نے بھارتیہ ساہتیہ پرشد کا خاکہ بہت پُرزور طریقے پر پیش کیا۔ پھر کراچی
میں کانگریس کے موقع پر کنہیا لال منشی سے جو میری بات چیت ہوئی
تو اس میں بھی ہم نے ایک ایسی سوسائٹی کی ضرورت کو محسوس کیا۔ پچھلے
سال جب اندور میں ہندی ساہتیہ سمیلن کا اجلاس مہاتما گاندھی کی
صدارت میں ہوا اور ہم ایک جا جمع ہوئے تو ایک مفصّل تجویز اس کے
متعلق منظور کی گئی، جسے عمل میں لانے کے لیے مسٹر کنہیا لال منشی، ہری ہر
شرما اور گردھاری شرما کی ایک کمیٹی بنائی گئی۔ ہندی ساہتیہ سمیلن کے
چند مہینے کے بعد مہاراشٹر ساہتیہ سمیلن کا اجلاس بھی اندور میں ہوا
اس نے بھی کولھاپور کے تخیل کو عمل میں لانے کے لیے ہندی ساہتیہ سمیلن
سے تبادلۂ خیالات کیا، ہندی ساہتیہ سمیلن نے کاکا کالیلکر، ہری بھاؤ اپادھیائے
اور بابا راگھوداس کو اندور بھیجا۔ اندور مہاراشٹر ساہتیہ سمیلن نے اپنی
ساہتیہ پرشد کو اطلاع دی کہ بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے لیے ایک مہاراشٹر
کمیٹی قائم کی جائے جو ہندی ساہتیہ سمیلن کو بھارت ساہتیہ سمیلن قائم
کرنے میں مدد دے۔ اسی طرح کرناٹک اور گجرات کی ساہتیہ سمیلنوں نے

بھی اس تحریک کو سراہا"۔

یہ تو ہی اس کی پیدائش اور ابتدا کی حقیقت۔ اب رہا اس کا مقصد سو وہ اس قرارداد سے ظاہر ہی جو ناگ پور کے اجلاس میں منظور کی گئی۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

اِس پرشد کا اُدیش (مقصد) ہوگا کہ (الف) ہندستان کی سب پرانتوں کی بھاشاؤں کے ساہتیوں (ادبوں) اور ساہتیکاروں (ادیبوں) میں آپس میں میل کرنا اور اس نام سے بھارتیہ ساہتیوں کی ترقی اور پھیلاؤ میں مددگار ہونا۔

(ب) اس سبھا کا کام ہندی یعنی ہندستانی میں ہوگا۔

اُس کمیٹی نے جو اس انجمن کے مقاصد کی تکمیل کے لیے مقرر کی گئی تھی پہلا کام یہ کیا کہ ماہانہ "ہنس" کو جو کئی سال سے ملک کے قابل ادیب منشی پریم چند صاحب کی ایڈیٹری میں جاری تھا اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا اور اب اُسے پرشد کا رسالہ بنانے کا فیصلہ کیا گیا ہی اور منشی پریم چند کے ساتھ گجراتی زبان کے ادیب اور مورخ مسٹر کنہیالال منشی بھی اس کی ایڈیٹری میں شریک ہوگئے ہیں۔ اس مختصر تمہید کے بعد جو بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی پیدائش اور مقاصد کے متعلق تھی، مَیں آپ کو اِس کے پہلے اجلاس کی روداد سنانا چاہتا ہوں جو ہم سب کے لیے خاص اہمیت رکھتی ہی۔

۲۴ اپریل ۱۹۳۶ء کو تقریباً دس بجے دن کو اس کا پہلا جلسہ شروع ہوا۔ سب سے اوّل مسٹر کاکا کالیکر نے اپنا اڈریس پڑھ کر سنایا۔ اُس کے بعد صدر انجمن مہاتما گاندھی کا مطبوعہ اڈریس جو صرف ایک صفحے کا تھا تقسیم کر دیا گیا اور مہاتما جی نے یہ کہہ کر کہ "مطبوعہ اڈریس پڑھ کر سنانا فضول ہی وہ اب خود پڑھ لیں گے" زبانی تقریر شروع کر دی۔ یہ ایسی آہستہ آواز میں

تھی کہ پاس والے بھی اچھی طرح سے نہ سُن سکے۔ پرشد کے اس جلسے کا سب سے بڑا کارنامہ وہ ریزولیوشن تھا جسے مَیں اوپر نقل کر چکا ہوں۔ زیادہ تر بحث اس پر رہی۔ اِس کے پہلے جُز سے کسی کو اختلاف نہ تھا۔ البتہ دوسرے جُز پر بہت کچھ گفتگو رہی۔ اس مسودے میں یہ الفاظ تھے کہ "اس پرشد (انجمن) کی ساری کارروائی "ہندی ہندستانی" میں ہوگی"۔ یہ لفظ پہلی بار یہاں سننے میں آیا۔ غالباً یہ مہاتما گاندھی کے جدت پسند دماغ کا نتیجہ تھا۔ مَیں نے مہاتما جی سے کہا کہ "انڈین نیشنل کانگریس نے اپنے ریزولیوشن میں یہ طے کیا تھا کہ "اِس ملک کی زبان ہندستانی ہوگی۔ خواہ وہ ناگری حروف میں یا فارسی حروف میں ہو"۔ اُس کے بعد آپ نے "ہنس" کے متعلق جو تحریر شایع کی اُس میں آپ لکھتے ہیں کہ "اس رسالے کے مضامین کی زبان ہندی اتھوا (یا) ہندستانی ہوگی"۔ اس کے کیا معنے"۔ فرمانے لگے کہ "کانگریس کے ریزولیوشن بھی مَیں نے ہی بنایا تھا"۔ مَیں نے عرض کیا کہ "یہ صحیح ہو لیکن ہم اُس وقت ہندستانی کے معنے ہرگز ہندی نہیں سمجھتے تھے"۔ کہنے لگے کہ "اَب مَیں نے اِس کے معنے بنا دیے ہیں جو "ہنس" کی تحریر میں آپ نے دیکھے"۔ یہ گاندھی جی کی محض زبردستی ہی۔ یہ انھوں نے ایک نیا لفظ ایجاد کیا ہو یعنے "ہندی ہندستانی" جو بالکل بے معنی ہی۔ یہی لفظ پرشد کی مجلسِ استقبالیہ کے صدر کاکا کالیلکر صاحب نے اپنے اڈریس میں استعمال کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہو کہ اِن صاحبوں نے پہلے سے یہ طے کر لیا تھا کہ ہندستانی کا لفظ تنہا استعمال نہ کیا جائے تاکہ اس کی گنجایش ہی باقی نہ رہے کہ ہم میں سے کوئی شخص اِس کا مفہوم "اُردو" لے سکے۔ جب گاندھی جی سے سوال کیا گیا کہ "ہندی ہندستانی" سے آپ کا کیا مطلب ہی"؟ تو فرمایا "وہ ہندی جو آگے چل کر

ہندستانی ہونے والی ہے"۔ اس پر یہ اعتراض کیا گیا یہ تو کوئی زبان نہ ہوئی، یہ تو آپ کی خواہش یا منتہا ہے۔ اس سوال کے جواب میں کہ "ہندی کون سی زبان ہے اور ہندستانی کون سی"؟ مہاتما جی نے فرمایا کہ "ہندی ادبی زبان ہے اور عام لوگ کم سمجھتے ہیں اور ہندستانی وہ زبان ہے جو عام لوگ بول چال میں استعمال کرتے ہیں لیکن ابھی اس کا ادب نہیں بنا"۔ اپنے مطبوعہ اڈریس میں انھوں نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ "ہندی کو ہندستانی کہنے کا یہ مطلب ہے کہ اس بھاشا میں اُن فارسی الفاظ کو جو زبان میں رائج ہو گئے ہیں ترک نہ کیا جائے"۔ غرض صبح کا جلسہ اس پر ختم ہو گیا اور کوئی بات طے نہ ہوئی۔

سہ پہر کے جلسے میں پھر یہی بحث چھڑ گئی۔ جب مہاتما جی سے یہ کہا گیا کہ "رزولیوشن میں یا تو آپ ہندی کا لفظ رکھیے یا ہندستانی کا، ہندی ہندستانی کے کوئی معنے نہیں"۔ تو فرمایا کہ "ہم یہ فیصلہ کر چکے ہیں اور میں ہندی کو نہیں چھوڑ سکتا، مجھے ہندی سمیلن کے ساتھ ساتھ چلنا ہے"۔ میں نے کہا کہ "آپ نیشنل کانگریس کے فیصلے کے ساتھ ساتھ کیوں نہیں چلتے جس نے یہ قطعی فیصلہ کر دیا ہے کہ ملک کی زبان ہندستانی ہوگی"۔ میں نے دانستہ دوبارہ یہ بات اس لیے کہی تھی کہ صبح کی گفتگو کے وقت پنڈت جواہر لال نہرو موجود نہ تھے، اس وقت وہ میرے قریب تشریف رکھتے تھے اور خیال تھا کہ وہ بہ حیثیت صدر کانگریس کے ضرور میری تائید کریں گے۔ لیکن مجھے افسوس اور کسی قدر مایوسی ہوئی کہ انھوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا اور خاموش بیٹھے رہے اور ایک نہیں وہاں اکٹھے تین کانگریس کے صدر موجود تھے (دو سابق اور ایک حال)، مگر کوئی ٹس سے مس نہیں ہوا۔ گاندھی جی نے میرے سوال کے جواب میں وہی کہا جو صبح فرما چکے

تھے۔ اِس کے بعد جب یہ گفتگو بڑھی تو گاندھی جی نے "ہندی ہندستانی" کو بدل کر "ہندی یعنی ہندستانی" کے الفاظ رکھ دیے۔ اس پر اختر حسین صاحب رائے پوری نے یہ ترمیم پیش کی کہ رزولیوشن میں یا تو لفظ 'ہندی' رکھا جائے یا 'ہندستانی'، کیوں کہ مہاتما جی خود ہندی اور ہندستانی کے دو الگ الگ مفہوم بتا چکے ہیں، اِس بنا پر ہندی اور ہندستانی ایک زبان نہیں ہو سکتیں اور اس لیے "ہندی یعنی ہندستانی" بے معنی ہوگا۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک لفظ رکھنا مناسب ہوگا۔ میں نے یہاں تک کہا کہ صرف آپ ہندی رکھیے اور میں اس کی تائید کروں گا۔ اِس پر وہ ہنسنے لگے اور کہا یہ نہیں ہوسکتا۔ آخر مہاتما جی نے ووٹ پر آمادگی ظاہر کی۔ مسٹر کنہیالال منشی نے کہا کہ یہ معاملہ ادبی اور لسانی ہے ووٹ سے طے نہیں ہونا چاہیے۔ مہاتما جی نے کہا کہ ووٹ کے سوا کوئی چارہ نہیں، فیصلے کی یہی ایک تدبیر ہے۔ ووٹ کا حکم صادر ہوا۔ لیکن ووٹ لینے سے پہلے بڑی ہوشیاری یہ کی گئی کہ ہندی سمیلن کے اُن نمایندوں کو بھی ووٹ کا حکم دے دیا گیا جو اُس وقت اس جلسے میں حاضر تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کثرتِ رائے اس ترمیم کے خلاف نکلی۔ اگر ہندی سمیلن کے نمایندوں کو ووٹ کی اجازت نہ دی جاتی جس کا انھیں حق حاصل نہ تھا تو ترمیم غالباً منظور کرنی پڑتی۔ مگر مہاتما گاندھی بھارتیہ ساہتیہ پرشد کو ہندی سمیلن کا بچّہ سمجھتے ہیں اور اُن کے تصور میں یہ دو مجلسیں کبھی الگ نہیں ہونے پاتیں، حالاں کہ بہ قول منشی پریم چند کے یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ پہلے دن کی کارروائی یہیں ختم ہوگئی۔

اصل معاملہ تو پہلے ہی دن طے ہو چکا تھا دوسرے دن ۲۵ اپریل

کو ایک معمولی جلسہ ہوا۔ پہلے دن سہ پہر کو ایک گفتگو یہ بھی چھڑ گئی تھی کہ ہمیں اپنی زبانوں کے ادب کا رُخ بدلنا چاہیے۔ بار بار پُرانے فرسودہ خیالی مضامین کو دُہرانا موجودہ حالات کے بالکل منافی ہو۔ ہمیں اپنے ادب کو زندہ اور زندگی کے حالات کے مطابق بنانا چاہیے۔ اس بحث میں پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی حصّہ لیا اور یہ ارادہ ہوا کہ دوسرے روز ایک رزولیوشن اِس مضمون کا پیش کیا جائے۔ کنہیا لال منشی اور دو ایک اور صاحب اس خیال کی مخالفت کرتے رہے۔ پرشد کے مہا پُرشوں نے اِس خوف سے کہ کہیں جدید خیال والے کوئی سخت رزولیوشن پیش نہ کر دیں، رات ہی کو اِس مضمون کا ایک ہلکا سا رزولیوشن تیار کیا اور دوسرے روز اجلاس شروع ہونے سے پہلے اسے پڑھ کر سنایا جو بلا اختلاف منظور کر لیا گیا۔ لیکن یہ رزولیوشن بہت کچھ تصریح کا محتاج تھا، اِس لیے اُن صاحبوں نے جو دیسی ادبیات کی اصلاح پر مُصر تھے۔ ایک الگ بیان شایع کیا۔ اِس کے بعد انتظامی کمیٹی کے ارکان کا انتخاب ہوا۔ اُن میں سے چند تو ہندی ساہتیہ سمیلن نے اپنے حق کی بنا پر اپنے نمایندے انتخاب کیے اور کچھ مہاراشٹ ساہتیہ سمیلن نے اور چند متفرق اشخاص منتخب ہوئے۔ بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے پہلے اجلاس کی کارروائی ختم ہوئی۔

اب اس کارروائی پر میں مختصر سا تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے یہ دیکھ لیا کہ ہندستانی کو ہندی میں اور ہندی کے معنے ہندستانی بنانے میں، پھر "ہندی ہندستانی" کے جدید لفظ کے اختراع میں اور آخر میں ہندی یعنی ہندستانی کے الفاظ میں کیسے کیسے پہلو بدلے ہیں۔ پہلے اُردو کا لفظ ترک کر کے ہندستانی اختیار کیا گیا تھا۔ یہاں تک کچھ مضائقہ نہ تھا اور اس پر

ہم بھی رضا مند تھے اور ہمارے بعض مستند ادیبوں اور اہل الرائے اصحاب
نے یہ لفظ لکھنا شروع کر دیا تھا بلکہ اُن کا اصرار تھا کہ اُردو کے بجائے
اب ہندستانی لکھا جائے اور اِس پر ایک حد تک عمل بھی ہونے لگا تھا۔
فریقین نے یہ سمجھوتا تسلیم کر لیا تھا۔ اب ہندستانی کا لفظ بھی متروکات
میں داخل ہوگیا اور صرف ہندی رہ گیا۔ معترض کے لیے اُن کے پاس
جواب موجود ہو وہی جو گاندھی جی نے فرمایا "ہندی یعنی ہندستانی" گاندھی جی
نے رسالۂ "ہنس" کی زبان کو بھی ہندی اتھوا ہندستانی فرمایا ہو۔ جب اُن
سے کہا گیا کہ "ہنس" کی زبان بہت کٹھن ہو وہ ہندستانی نہیں ہو سکتی بلکہ
اُس کی زبان کلکتہ کے مشہور رسالہ "وِشال بھارت" سے بھی زیادہ مشکل
ہو تو اُنھیں حیرت ہوئی۔ "ہنس" کے ایڈیٹروں نے تو صاف صاف لکھ
دیا ہو کہ "اب ہندی ملکی زبان کی صورت اختیار کر کے خاص و عام کی
زبان ہو چکی ہو مہاتما گاندھی جیسے ملک کے سُدھارنے والے اسے
زندہ ملکی زبان بنانے کا عہد کر چکے ہیں"۔ اس کی تائید بابو راجندر پرشاد
کے اس خطبۂ صدارت سے بھی ہوتی ہو جو انھوں نے ہندی ساہتیہ سمیلن
میں پڑھا تھا۔ اِس میں انھوں نے بھارتیہ پرشد کا ذکر کرتے ہوئے
فرمایا کہ "خوشی کی بات ہو کہ اس کمیٹی کی کوشش سے بھارتیہ ساہتیہ پرشد
کی بنیاد ڈالی جا رہی ہو اور اس کا پہلا اجلاس اس ناگ پور میں مہاتما گاندھی
کی صدارت میں ہو رہا ہو۔ اس کے ذریعے سے ایک فائدہ یہ ہو گا کہ ہندی
کے پرچار کے متعلق لوگوں میں جو غلط فہمی پھیلی ہوئی ہو وہ بھی دُور ہو
جائے گی اور ہمیں امید ہو کہ اس سے ہندی پرچار میں مدد ملے گی"۔
کاکا کالیلکر صاحب نے بھی اپنے اڈریس میں صاف طور پر اس کا اعلان

کیا ہو۔ فرماتے ہیں کہ "جن لوگوں نے اس تحریک (بھارتیہ ساہتیہ پرشد) کی ابتدا کی ہو انھوں نے یہ فیصلہ کر لیا ہو کہ ہمارا سارا کاروبار راشٹر بھاشا (قومی زبان) "ہندی ہندستانی" میں چلے گا۔ ہماری کوشش ہو کہ تمام ہندستان کی بھاشاؤں کی ابجد ایک ہی ہو اور سب میں ناگری لپی (رسم خط) جاری ہو جائے تاکہ وہ اپنے اپنے صوبے کی زبان کا کام دیو ناگری میں کریں"۔

یہ الفاظ ایسے صاف اور صریح ہیں کہ اِن کے لیے کسی دلیل اور حُجّت کی ضرورت نہیں۔ بھارتیہ ساہتیہ پرشد کا یہ مقصد بے شک قابلِ تعریف ہو کہ وہ دیسی زبانوں کی ادبیات کی اصلاح و ترقی چاہتی ہو، لیکن اِس کا دُوسرا مقصد بلاشبہہ ہندی زبان کا پرچار ہو جس میں وہ اور ہندی سمیلن متفق ہیں اور غالباً یہی وجہ ہو کہ پرشد کے اجلاس کی تاریخیں اور مقام بدل کر اُسے اُنھی ایام اور اُسی مقام میں رکھا گیا جن تاریخوں میں اور جہاں ہندی سمیلن کا اجلاس تجویز ہوا تھا تاکہ ہندی سمیلن کے اثر اور امداد سے مستفید ہو سکے۔ غرض یہ کہ پرشد ادبیات کے مسئلے سے گزر کر زبان کی اشاعت پر آ گئی ہو اور مختلف زبانوں کے ادب اور ادیبوں کے اتحادِ عمل سے ہندی کے پرچار کا مقصد حاصل کرنا چاہتی ہو۔

اس ضمن میں مَیں اس امر کا اظہار ضروری خیال کرتا ہوں کہ منشی پریم چند صاحب شروع سے آخر تک ہمارے ساتھ رہے اور وہ اس تمام گفتگو اور بحث سے بددل ہی نہیں بلکہ برہم بھی ہوتے۔ اُن کی دلی تمنا تھی کہ ہندی اُردو کے جھگڑے کو مٹا کر کوئی ایسی صورت پیدا کی جائے جو دونوں فریقوں میں مقبول ہو سکے۔ لیکن جو کارروائی وہاں ہوئی اِس سے وہ بھی ایسے ہی مایوس ہوئے جیسے ہم میں سے بعض لوگ۔

اِسی گفتگو میں بنگال مہاراشٹر اور جنوبی ہند کے بعض علاقوں کے نمایندوں نے یہ کہا (اور غالباً اُن کا یہ کہنا ایک حد تک درست ہی) کہ ہندی میں سنسکرت الفاظ کا قائم رکھنا یا داخل کرنا ضروری ہی کیوں کہ ان سنسکرت لفظوں کا سمجھنا ہمارے لیے زیادہ آسان ہی بہ نسبت اُن ہندی اور فارسی لفظوں کے جو آپ کی سہل ہندی میں استعمال ہوتے ہیں۔ اِس لیے کہ ہماری زبانوں میں پہلے ہی سے سنسکرت الفاظ بہ کثرت موجود ہیں۔ اِن زبانوں کی بنیاد زیادہ تر سنسکرت پر ہی۔ اس خیال کی تائید کاکا کالیلکر کے اڈریس سے بھی ہوتی ہی جس میں وہ فرماتے ہیں کہ "میں اہلِ دکن کی طرف سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ ہم کو آپ کی (یعنی شمالی ہند کی) ہندی سمجھنے میں مشکل پڑتی ہی۔ پنڈت جواہر لال کی ہندی آپ کے لیے عام فہم ہوگی مگر ہمارے لیے کٹھن ہی...... وہ ہندی بھی جو دلّی لکھنؤ کے بازاروں گنوار لوگ سمجھ سکتے ہیں وہ نیچرل ہندی ہو لیکن اُسے بھی ہم بہت ہی کم سمجھتے ہیں...... کانگریس میں جو ہندی بولی جاتی ہی اُس میں فارسی شبدوں کی اس قدر بھرمار ہوتی ہی کہ دیہات سے آنے والے نمایندوں کے لیے انگریزی اور ہندی دونوں بھاشائیں یک ساں مشکل ہو جاتی ہیں۔"

اسی دوران میں لُغت کی بحث نکلی یعنی ایک ایسی ڈکشنری تیار کی جائے جس میں عام فہم الفاظ کے علاوہ وہ تمام الفاظ جمع کیے جائیں جو ہندی، بنگالی، گجراتی، مرہٹی وغیرہ میں مشترک ہیں اور اُن تمام الفاظ کی تعداد دو ڈھائی ہزار سے زیادہ نہ ہو۔ اس میں دو مشکلیں ہیں ایک تو یہ کہ ہندی اور خاص کر فارسی الفاظ کی صورتیں مختلف زبانوں میں بگڑ بگڑ کر ایسی ہو گئی ہیں کہ ایک لفظ ہونے پر بھی اُن کا پہچاننا مشکل ہوتا ہی۔

دؤسرے لفظ تو ایک ہی ہو لیکن مرہٹی میں اس کے معنی کچھ ہیں اور ہندی یا بنگالی میں کچھ اور۔ علاوہ اِس کے ایسی ڈکشنری اُن مبتدیوں کے لیے تو کسی قدر کارآمد ہو سکتی ہو جو زبان سیکھنا چاہتے ہیں لیکن ادَب کی ضروریات کے لیے بالکل کارآمد نہیں ہو سکتی۔ مَیں نے ۱۹۳۳ء میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس میں جس کا اجلاس بڑودہ میں ہوّا تھا، یہ تجویز پیش کی تھی اور اس پر عمل بھی شروع کر دیا تھا کہ تمام ہندی ادب اور زبان کو پڑھ کر اُردؤ، فارسی و عربی الفاظ اور محاورے چُن لیے جائیں اور اسی طرح اُردو ادب اور زبان کا مطالعہ کر کے تمام ہندی الفاظ اور محاورے نکال لیے جائیں اور ان سب کو ایک جا جمع کر کے کتاب کی صؤرت میں شایع کیا جائے تاکہ معلوم ہو کہ ہماری زبان کا مشترکہ سرمایہ کیا ہو۔ اِس کے بعد جن الفاظ کے اضافے کی ضرؤرت ہو یا جو اصطلاحات بنانی مقصود ہوں تو وہ ایک ایسی کمیٹی کے مشورے سے ہو جس میں دونوں زبانوں کے نمایندے ہوں لیکن موجودہ حالت دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہو کہ اس قسم کی تمام کوششیں بے سؤد ہیں۔

مَیں ایک بات کہنی بھؤل گیا وہ یہ کہ پہلے دن کے اجلاس میں پروفیسر محمد مجیب (جامعہ مِلّیہ دہلی) کا ایک خط انگریزی زبان میں مہاتما جی کے نام موصول ہوّا۔ یہ خط نہایت معقول اور مدلّل ہو اور بہت ادب اور خلوص سے مہاتما جی سے یہ اپیل کی ہو کہ وہ نیشنل کانگریس کے فیصلے پر قائم رہیں جس نے ملک کی زبان ہندستانی قرار دی ہو۔ انھوں نے مہاتما جی کی اِندور والی تقریر اور نیز "ہنس" والی تجویز کی طرف بھی اشارہ کیا ہو۔ جن میں ہندی یا ہندستانی کا لفظ استعمال کیا گیا ہو اور ہندی کے معنی ہندستانی قرار دیے ہیں جو درست نہیں۔ اُردؤ یا ہندستانی سے بالکل قطع نظر کی گئی ہو۔ بھارتیہ

ساہتیہ پرشد کے قائم ہونے اور "ہنس" کے جاری ہونے سے اُن کو بہت خوشی ہوتی تھی کہ یہ مشترکہ اور عام زبان بنانے میں مضبوط بنیاد کا کام دیں گے لیکن "ہنس" کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ اس میں زیادہ تر سنسکرت آمیز ہندی کا استعمال کیا گیا ہو اور اس کی زبان دوسرے ہندی رسالوں کی زبان سے مشکل ہو۔ مجیب صاحب ساہتیہ پرشد کے ساتھ "بھارت" کے لفظ کو بھی پسند نہیں کرتے۔ کیوں کہ اِس لفظ کا مفہوم آریاتی ہندستان ہوتا ہو اور اس لیے اس سے نہ صرف مسلمان اور اُن کی تمام کوششیں جو ہندی زندگی بنانے میں صرف ہوئیں بلکہ صدہا سال کے تغیرات اور ارتقائی منازل جو ہم نے طے کیے ہیں وہ بھی خارج ہو جاتے ہیں۔ اُن کی رائے میں بھارت کی جگہ ہندستانی زیادہ مناسب ہوتا۔

مجیب صاحب نے ایک بات اور لکھی جو صحیح معلوم ہوتی ہو کہ اگرچہ عربی اور سنسکرت میں اصطلاحی الفاظ کا بہت بڑا خزانہ ہو لیکن ہماری عام اور مشترکہ زبان کو اُن میں سے کسی پر بھی منحصر نہیں کرنا چاہیے۔ عربی اگر غیر زبان ہو تو سنسکرت بھی اس ملک میں کبھی عام طور پر نہیں بولی جاتی تھی۔ جو لوگ ہندی زبان سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہندی میں سنسکرت کے الفاظ اصلی حالت میں نہیں پائے جاتے۔ تلفظ کی سہولت نے ان کی صورتوں کو کچھ کا کچھ کر دیا ہو۔ مثلاً گرام کا گانو ہو گیا، ورش کا برس بن گیا۔ اب پھر اصل سنسکرت الفاظ کی طرف رجوع کرنا اور مروجہ الفاظ کو ترک کرنا یا تو اظہارِ مشیخت ہو یا جہل یا تعصب پر مبنی ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہو کہ یہ حضرات اُس زندہ زبان کی اشاعت سے کچھ سروکار نہیں رکھتے جو عام طور پر بولی جاتی ہو بلکہ انھیں ہندی

زندگی کو آریائی زندگی بنانے کی فکر ہی۔ مجیب صاحب نے اس خط کا بھی ذکر کیا ہی جو مسٹر کنہیا لال منشی نے عاقل صاحب (جامعہ ملیہ) کے خط کے جواب میں تحریر فرمایا تھا۔ اُس میں مسٹر منشی لکھتے ہیں کہ "گجراتیوں، مرہٹوں اور کرالیوں نے جن روایات پر اپنی ادبی زبان کو بنایا ہی۔ اُن میں اُردو کا عنصر تقریباً معدوم ہی"۔ مجیب صاحب اِسے تسلیم نہیں کرتے وہ لکھتے ہیں کہ "اس میں مطلق شبہہ نہیں کہ گجراتی و مرہٹی اور بنگالی زبانوں میں فارسی الفاظ کی بہت بڑی تعداد موجود ہی۔ اور میں ہرگز اس امر کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ انھیں آپس میں ایک دوسرے سے نیز مسلمانوں سے قریب آنے کے لیے اپنی زبانوں کو سنسکرت آمیز بنانے کی ضرورت ہی۔ علاوہ اِس کے صرف خالص اُردو سے ہمیں بحث نہیں بلکہ ہماری بحث شمالی ہند کی زندہ زبان اور محاورات سے ہی۔ اگر یہ زندہ زبان مشترکہ زبان کی بنیاد قرار دی جائے تو مسلمان پوری طرح اس کا ساتھ دینے کے لیے آمادہ ہیں۔ لیکن سنسکرت کی طرف رجعت کرنے کے یہ معنے ہیں کہ وہ (مسلمان) اور اُن کی تمام خدمات جو انھوں نے ہندی، بنگالی اور گجراتی کے حق میں کی ہیں ناقابلِ لحاظ ہیں۔ اِن حالات میں ہم سے شرکت کی درخواست کرنا گویا ہماری ہلاکت میں خود ہماری شرکت کی استدعا کرنا ہی۔

اس کے بعد انھوں نے مسٹر پرشوتم داس ٹنڈن کی اِس تقریر کا ذکر کیا ہی جو انھوں نے الہ آباد میں ہندی میوزیم کے افتتاح کے وقت فرمائی تھی اور جس میں انھوں نے یہ کہا تھا کہ "چینی زبان کے بعد ہندی زبان ایشیا میں سب سے زیادہ بولی جاتی ہو۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ

کہ عام اور مشترکہ زبان کا سوال طے ہوگیا۔ یعنی وہ ہندی ہوگی۔ کیوں کہ ہندستان میں اسی زبان کے بولنے والے زیادہ تعداد میں ہیں۔ لہٰذا ہندستانی کے حامی کسی گنتی میں نہیں۔ یہ فرقہ وارانہ تصفیہ کی طرح ایک نئے فساد کی بنیاد ڈالی جارہی ہی"

خط کے آخر میں پروفیسر مجیب نے چند امور خاص طور پر مہاتما جی کے غور کے لیے پیش کیے ہیں اور اُن سے التجا کی ہی کہ اگر وہ مناسب خیال فرمائیں تو وہ عام اعلان کی بنیاد کا کام دے سکتے ہیں۔ وہ امور یہ ہیں:-

(۱) ہماری مشترکہ زبان ہندستانی کے نام سے موسوم ہوگی نہ کہ ہندی کے نام سے۔

(۲) ہندستانی کو کسی فرقے کے مذہبی روایات سے مطلق کوئی تعلق نہ ہوگا۔

(۳) لفظ کا معیار اُس کا رواج ہوگا نہ کہ اُس کا دیسی یا بدیسی ہونا۔

(۴) تمام وہ الفاظ جو اُردو کے ہندو اہلِ قلم نے اور ہندی کے مسلمان مصنفوں نے استعمال کیے ہیں مروجہ الفاظ تسلیم کیے جائیں۔

(۵) اصطلاحی الفاظ خاص کر سیاسی اصطلاحات کے انتخاب میں سنسکرت کی اصطلاح کو ترجیح نہ دی جائے بلکہ اُردو، ہندی اور سنسکرت کی مصطلحات کے فطری انتخاب کی بھی گنجایش رکھی جائے۔

(۶) دیوناگری اور عربی رسمِ خط دونوں مسلّم خیال کیے جائیں اور اِن تمام اداروں میں جن کی پالیسی ہندستانی کے حامیوں کے ہاتھ میں ہو، دونوں خطوں کے سکھانے کی سہولت بہم پہنچائی جائے۔

بیں نے خط کا خلاصہ بیان کر دیا ہو۔ پورا خط پنڈت جواہر لال نہرو نے پڑھ کر سنایا۔ اس پر کوئی توجہ نہیں کی گئی اور خط داخلِ دفتر ہو گیا۔ البتہ پنڈت جواہر لال صاحب نے یہ فرمایا کہ "تعجب ہو کہ مجیب صاحب جیسے تعلیم یافتہ شخص کو ٹنڈن کے بیان پر اعتراض ہو، ان کا ہرگز یہ مطلب نہ تھا"۔ اُن کا کیا مطلب تھا یہ سمجھ میں نہ آیا۔ جس خلوص اور امید اور لجاجت کے ساتھ یہ خط مہاتما جی کی خدمت میں لکھا گیا تھا اُس کا تقاضا یہ تھا کہ مہاتما جی اس بارے میں اپنا کوئی خیال ظاہر فرماتے اور جو بدگمانی اُن کے اور اُن کے رفقا کے رویّہ سے پیدا ہوگئی تھی اُسے رفع کرتے۔ لیکن افسوس کہ انھوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ اِن حضرات نے ہندی کے پرچار اور اُسے قومی زبان بنانے کا تہیہ کر لیا ہو۔

اجلاس کے دوران میں جب کہ زبان کی بحث چھڑی ہوئی تھی مہاتما گاندھی نے ایک ایسی بات کہی جسے سُن کر مجھے بے حد تعجب اور افسوس ہوا۔ انھوں نے فرمایا کہ "اُردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہو، قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہو اور مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں"۔ حیرت ہو کہ جس شخص کی صحبت میں مدتوں مولانا محمد علی مرحوم، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر سید محمود جیسے لوگ رہے ہوں وہ اپنی زبان سے ایسی بات نکالے جو سرتاسر غلط، بے بنیاد اور بے اصل ہو۔ بیں ہر چند یہ توجیہ کر کے اپنی تسلی کرنا چاہتا ہوں کہ مہاتما جی نے یہ بات ناواقفیت کی بنا پر کہی لیکن دل نہیں مانتا۔

مہاتما جی اپنی تقریر میں ہندی اُردو یا ہندستانی کی بحث میں بار بار ہندو اور مسلمان کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ مَیں نے ایک آدھ بار ٹوکا یہ ہندو مسلم سوال نہیں ہی بلکہ بحث ہندی اُردو یا ہندستانی کی ہی۔ ہزارہا ہندو ایسے ہیں جن کی زبان اُردو ہی وہ اُردو کے ادیب ہیں، اسی طرح مسلمان ہیں جو ہندی بولتے اور لکھتے ہیں۔ اِس لیے اس بحث کو فرقہ واری رنگ نہیں دینا چاہیے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہی کہ گاندھی جی کا دماغ اور خیال انحطاط پزیر ہو رہا ہی۔ اسی ضمن میں مَیں نے گاندھی جی سے یہ بھی عرض کیا کہ "مہاتما جی آپ کو یہ بھی معلوم ہی کہ اُردو زبان میں ہندی کے الفاظ اور محاورے جس کثرت سے ہیں خود ہندی زبان میں اُسی قدر نہیں۔" یہ سُن کر گاندھی جی اور دوسرے صاحبوں کو بڑی حیرت ہوئی۔ مَیں نے کہا "مَیں نے اس پر خوب غور کیا ہی اور مَیں اپنے اِس دعوے کو ثابت کر سکتا ہوں۔" گاندھی جی نے فرمایا کہ "یہ کیوں کر ہوا؟" مَیں نے کہا کہ "اس کی وجہ یہ ہی کہ اُردو زبان کی بنیاد عوام کی زبان پر ہی جو اُس وقت بولی جاتی تھی اور اس لیے اس میں وہ تمام ہندی لفظ اور محاورے آ گئے جو عام لوگوں کی زبان پر تھے۔ ہندی زبان کتابی ہی۔ عوام کی بولی سے اسے بہت کم سابقہ رہا ہی، اِسے جب کسی لفظ کی ضرورت ہوتی ہی تو سنسکرت کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہی۔ اس لحاظ سے اُردو ہندی کی نسبت زیادہ ہندی ہی۔"

ایک دن وہ تھا کہ مہاتما گاندھی نے ہندستانی یعنی اُردو زبان اور فارسی حروف میں اپنے دستِ خاص سے حکیم اجمل خاں کو خط لکھا تھا اور آج یہ وقت آ گیا ہی کہ اُردو تو اُردو وہ تنہا ہندستانی کا لفظ بھی

سُننا اور لکھنا پسند نہیں کرتے۔ اُنھوں نے اپنی گفتگو میں جو برسرِ اجلاس تھی، ایک بار نہیں کئی بار فرمایا کہ "اگر رزولیوشن میں تنہا ہندستانی کا لفظ رکھا گیا تو اس کا مطلب اُردو سمجھا جائے گا"۔ لیکن اُن کو نیشنل کانگریس کے رزولیوشن میں تنہا ہندستانی کا لفظ رکھتے ہوئے یہ خیال نہ آیا۔

آخر اِس قلبِ ماہیت (CHANGE OF HEART) کی کیا وجہ ہو؟ کون سے ایسے اسباب رونما ہوتے ہیں جو اِس حیرت انگیز انقلاب کا باعث ہوئے۔ غور کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس تمام تغیر و تبدّل اور داؤ پیچ کا باعث ہمارے ملک کا بدنصیب پالٹیکس ہو۔ جب تک مہاتما گاندھی اور اُن کے رفقا کو یہ توقع تھی کہ مسلمانوں سے کوئی سیاسی سمجھوتا ہو جائے گا اُس وقت تک وہ ہندستانی ہندستانی پکارتے رہے جو تھپک کر سُلانے کے لیے اچھی خاصی لوری تھی۔ لیکن جب انھیں اس کی توقع نہ رہی یا انھوں نے ایسے سمجھوتے کی ضرورت نہ سمجھی۔ تو ریا کی چادر اُتار پھینکی اور اصلی رنگ میں نظر آنے لگے۔ وہ شوق سے ہندی کا پرچار کریں۔ وہ ہندی نہیں چھوڑ سکتے تو ہم بھی اُردو نہیں چھوڑ سکتے۔ اُن کو اگر اپنے وسیع ذرائع اور وسائل پر گھمنڈ ہو تو ہم بھی کچھ ایسے ہیٹے نہیں۔

ایسی صورت میں ہمارے لیے اس کے سوا اب کوئی چارہ باقی نہیں کہ ہم اپنی زبان کے بچانے اور اُس کی اشاعت اور ترقی کے لیے کمربستہ ہو جائیں۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ اس کے متعلق ہم ایک مفصّل تجویز عنقریب پیش کرنے والے ہیں۔"

مذکورہ بالا مضمون میں "بھارتیہ ساہتیہ پریشد" کے اجلاس ناگ پور کا کچّا چِٹھا پیش کر دیا گیا ہو۔ اس کے بعد گاندھی جی کے لیے بہ مشکل کچھ اور لکھنے کی

گنجایش نکل سکتی تھی لیکن انھوں نے اس کے بعد ایک نہیں دو تین مضمون لکھے۔ یہ اور بات ہو کہ انھوں نے سلجھانے کی کوشش میں معاملے کو اور اُلجھا دیا۔ اس کے متعلق بھی ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی تحریر ملاحظہ فرمایئے:۔

غلط فہمیوں کے جالے

"اُوپر کی تحریر کے کچھ دنوں بعد یکم اگست کا "ہریجن" ملا جس میں گاندھی جی نے "غلط فہمیوں کے جالے" کے عنوان سے ایک مختصر مضمون لکھا ہو اور اُن (غلط فہمیوں) کے رفع کرنے کی کوشش کی ہو جو بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی رو داد کے متعلق اُردو اخباروں میں پیدا ہو گئی ہو۔

۱۔ سب سے اوّل انھوں نے بابو پرشوتم داس ٹنڈن کی تقریر کی حمایت کی ہو۔ فرماتے ہیں کہ "بابو صاحب نے جو اپنی تقریر میں یہ کہا تھا کہ ۲۳ کروڑ ہندستانی ہندی بولتے یا کم سے کم سمجھتے ہیں تو اِس میں وہ لوگ بھی شریک ہیں جو اُردو بولتے ہیں خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ اگر بابو صاحب کی پوری تقریر معترضین کے سامنے ہوتی تو یہ غلط فہمی نہ ہوتی"۔ لیکن اخباروں میں جو ان کی تقریر شایع ہوئی اُس سے کہیں یہ ظاہر نہیں ہوتا۔ خود مہاتما جی نے جو تقریر بابو صاحب کی تائید میں اُس وقت کی تھی، اُس میں بھی اُنھوں نے یہی الفاظ دُہرائے اور اس کی مطلق صراحت نہیں کی کہ ہندی سے کیا مُراد ہو۔

خود بابو صاحب نے اس کے بعد کبھی اس کی تصریح نہیں کی اور نہ اِس الزام کی تردید کی۔ یہ معاملہ مدعی سُست گواہ چُست کا ہو۔ کیا اچھا ہوتا اگر بابو صاحب کی پوری تقریر عام طور پر اخباروں میں شایع

کی جاتی تاکہ یہ غلط فہمی خود بہ خود رفع ہو جاتی۔ ایسا نہیں کیا گیا۔

دوسری بات اس کے متعلق مہاتما جی نے یہ لکھی ہے کہ "اندور میں میں جو رزولیوشن منظور کیا گیا تھا اُس میں ہندی سے مراد وہ زبان تھی جو شمال میں ہندو مسلمان دونوں بولتے ہیں خواہ وہ دیوناگری میں لکھی ہو یا اُردو رسم خط میں"۔ ہمارے سامنے وہ رزولیوشن نہیں ہے اور اس لیے ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس کے ٹھیک الفاظ کیا تھے۔ ہماری سمجھ میں یہ بات اب تک نہیں آئی کہ جب "ہندستانی" کے معنے عام طور پر یہی سمجھے جاتے ہیں اور یہ لفظ انھی معنوں میں استعمال ہوتا ہے تو پھر کیا ضرورت تھی کہ ہندی کہہ کر اس کے وہ معنے تبلائے جائیں جو ہندستانی کے ہیں اور بلا وجہ غلط بحث پیدا کیا جائے۔ مہاتما جی کیوں کالم کے کالم اِس توجیہ اور تاویل میں صَرف کرتے ہیں کہ ہندی کے یہ معنے ہیں اور ہندی کے وہ معنے ہیں، جب کہ ہندستانی کا لفظ پہلے سے موجود ہے جس کے یہی معنے ہیں اور ہر شخص بغیر کسی توجیہ اور تاویل کے سمجھ سکتا ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے جلسے میں سوال کرنے پر جو تعریف اُنھوں نے ہندستانی کی کی تھی ـــ وہی تھی جواب وہ ہندی کی کرتے ہیں اور ہندی کی تعریف بالکل دوسری کی تھی۔ ہمارے لیے یہ بالکل ایک معمّا ہے۔

وہ فرماتے ہیں کہ "ہندی، ہندستانی" کا لفظ میری تحریک پر اختیار کیا گیا تھا تاکہ اس مرکب لفظ کے ذریعے سے ہندی کی تعریف کے معنے صاف ظاہر ہو جائیں"۔ اس مرکب کی مطلق ضرورت نہ تھی جب کہ وہی مفہوم "ہندستانی" کے لفظ سے ظاہر ہوتا ہے اور عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔

مہاتما جی نے مجھ پر یہ غلط الزام لگایا ہو کہ میں نے بجائے "ہندی، ہندستانی" کے "ہندی، اُردو" کے استعمال کی تحریک کی۔ میں نے ہرگز اس کی تحریک نہیں کی تھی بلکہ میں نے یہ عرض کیا تھا کہ "یا تو اِس رزولیوشن میں ہندی کا لفظ رکھا جائے یا ہندستانی کا ہندی، ہندستانی بے معنی ہو۔ سب بحث کرنے کے بعد وہ آخر میں حسبِ معمول فرماتے ہیں کہ "ہندی ہندستانی اُردو مترادف لفظ ہیں اور اُن سے مراد ایک ہی زبان ہو۔" مہاتما جی اس معاملے میں ہر مضمون کی تمہید دوسروں کے سوئے ظن سے شروع کرتے ہیں اور اپنے کو اور اپنے رفقا کو اس سے بری بتاتے ہیں۔ یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہو۔ "بدگمانی پیدا کرنے والے کو ایسی باتوں سے ہمیشہ تسکین ہوتی ہو۔"

ہندی اُردو کے متعلق گاندھی جی کی تصریحات

"اکھل بھارتیہ ساہتیہ پرشد" کے اجلاس ناگ پور کے بعد مہاتما گاندھی نے اپنے اخبار "ہریجن" میں دو مضمون لکھے ہیں۔ ان مضامین کا باعث دو تحریریں ہوتیں۔ ایک تو "بمبئی کرانیکل" کا مضمون اور دوسرا وہ خط جو انھیں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جانب سے عین اجلاس میں وصول ہوا تھا۔ یہ خط سب کے سامنے برسرِ اجلاس پڑھا گیا تھا اُس وقت مہاتما گاندھی اور اُن کے رفقا میں سے کسی نے ایک لفظ بھی نہ کہا اور بات آئی گئی ہوتی۔ اب سب کچھ طے ہو جانے کے بعد (یعنی بعد از جنگ) اس پر جو خامہ فرسائی کی گئی ہو اِس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ اُن مضامین میں زیادہ تر بحث اُسی خط سے متعلق ہو جس کا جواب جامعہ ملیہ (یا پروفیسر حبیب) کے ذمّے ہو اور

اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے بیانات کی تصریح مجھ سے بہتر کر سکتے ہیں۔
لیکن ایک طرف اُن کی خاموشی نے اور دوسری طرف اس اندیشے نے کہ
مہاتما جی کی تحریر جو بعض حلقوں میں آیت و حدیث کا درجہ رکھتی ہو،
غلط فہمی کا باعث ہوگی، مجھے اِن چند سطروں کے لکھنے پر مجبور کیا اور
چوں کہ مَیں بھی پرشد کے اجلاس میں حاضر اور گفتگو میں شریک تھا، اس
لیے اس موقع پر میرا خاموش رہنا نا مناسب ہی نہیں بلکہ داخل معصیت ہو تا ہو

مہاتما گاندھی فرماتے ہیں کہ یہ کہنا صحیح نہیں ہو کہ "اُردو ہندستان
کے تمام مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہو"۔ ہم مانتے ہیں کہ اُن کا یہ قول "ایک
حد" تک صحیح ہو لیکن اگر بعض مقامات کے مسلمان اُردو نہیں سمجھتے یا وہ
سارے ہندستان میں مسلمانوں کی مشترکہ زبان نہیں ہو تو ہندی بھی خیر
سے ہندوؤں کی مشترکہ زبان نہیں۔ اور ہندستان کے متعدد علاقے ایسے
ہیں جہاں ہندو ہندی زبان سے مطلق ناآشنا ہیں۔ اِس معاملے میں
اُردو کو پھر بھی ترجیح ہو کہ وہ سوائے چند خاص محدود مقامات کے
ہندستان کے مسلمانوں میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہو۔ ہندی ابھی
یہ دعوا نہیں کر سکتی۔ علاوہ اس کے پرشد کے جلسے میں تو اُردو بے چاری
کا کوئی سوال ہی نہ تھا، اصل بحث ہندی اور ہندستانی کی تھی، گاندھی جی
خواہ مخواہ اُردو کو اِس لپیٹ میں لے آتے ہیں۔

اصل اعتراض ہمارا یہ تھا کہ پرشد کے رزولیوشن میں تنہا ہندستانی
کا لفظ کیوں نہیں رکھا گیا؟ اس کا جواب جو مہاتما جی نے دیا ہو وہ قابل
سننے کے ہو اور قابل یاد رکھنے کے ہو۔ فرماتے ہیں کہ "ہندی ساہتیہ سمیلن
پچیس سال سے قائم ہو مَیں اس کا نیا نیا ممبر ہوں، میرے لیے یہ زیبا نہیں

کہ میں اس کا نام تبدیل کرنے کی جرأت کروں"۔ ہم نے کبھی اُن سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ وہ ہندی ساہتیہ سمیلن کے نام میں تبدیلی کریں، ہماری طرف سے اگر ایسی خواہش کی جائے تو بالکل ناواجب ہوگی۔ اس تمہید کے بعد وہ پرشد کی طرف آتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ "یہ ہندی سمیلن کا بچّہ ہو اور شمالی ہند کے ہندو مسلم دونوں کی خدمت کرنا چاہتا ہو جن کی مادری زبان ایک ہو، لہٰذا اس میں کوئی مضائقے کی بات نہیں کہ اس کی زبان ہندی ہو یا ہندستانی۔ میرے لیے دونوں برابر ہیں"۔

جس صورت میں آپ کے لیے دونوں برابر ہیں تو کیا وجہ ہو کہ ایک بڑی جماعت کی یہ خواہش تھی کہ صرف ہندستانی کا لفظ رکھا جاتے تو آپ نے منظور نہ کیا اور جب فیصلہ کا انحصار ووٹ پر رکھا گیا تو ہندی سمیلن کے اُن نمایندوں کو جو بہ طور تماشائیوں کے پرشد کے جلسے میں حاضر تھے ووٹ دینے کا حق دے دیا۔ اگر یہ ہوشیاری نہ کی جاتی تو ووٹ ہندستانی کے حق میں ہوتے۔ مہاتما جی کو ہندی سمیلن کا تو اِس قدر پاس ہو لیکن ہندستان کی سب سے بڑی، قومی اور منظم جماعت یعنے نیشنل کانگریس کا کچھ بھی خیال نہیں جس کے بھرے اجلاس میں ملک کی زبان ہندستانی قرار دی گئی۔ اور لُطف یہ کہ (بہ قولِ مہاتما جی) وہ رزولیوشن بھی اُنھی کے فکر کا نتیجہ اور اُنھی کا لکھا ہوا تھا۔ اِس میں شک نہیں کہ پرشد ہندی سمیلن ہی کی بدولت وجود میں آئی لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ ہر امر میں اِس کے تابع ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اُس کی ایک شاخ ہوتی اور اس کے جلسے ہندی سمیلن ہی کے اجلاس میں اور اُس کی نگرانی میں ہوتے۔ پرشد آزاد جماعت ہو۔ ہندی سمیلن کا مقصد ہندی زبان کا پرچار ہو۔

پرشد کا یہ مقصد نہیں اِس کا پورا نام "اکھل بھارتیہ ساہتیہ پرشد" ہو یعنی ہندستان بھر کی ادبیات کی مجلس۔ اگر پرشد سمیلن کا بچہ یا شاخ تھی تو ہندی ہندستانی کے مسئلے کو بحث میں کیوں لایا گیا، اس پر ووٹ کیوں لیے گئے؟ صاف کہہ دیا جاتا کہ وہ سمیلن سے وابستہ ہو اس کی زبان ہندی ہی ہو گی۔ اب بھی اگر پرشد اپنا نام بدل کر ہندی سمیلن کی شاخ بن جائے تو ہمیں اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہو گا اور ہم اپنے دعوے سے دست بردار ہو جائیں گے۔ ہم مہاتما گاندھی جی کی اُن تصریحات سے بالکل مطمئن نہیں۔

مہاتما جی بدگمانی کو بُری نظر سے دیکھتے ہیں اِن کا فرمانا بالکل بجا ہو۔ لیکن بدگمانی پیدا کرنے کے بعد بدگمانی رفع کرنے کی کوشش کرنا فعلِ عبث ہو۔

پہلے آرٹکل کے آخری جملے میں گاندھی جی نے ہندی ساہتیہ سمیلن اور پرشد کے مقاصد کو پھر گڈ مڈ کر دیا اور بدگمانی کا ایک نیا موقع پیدا کر دیا ہو۔

دوسرے آرٹکل میں مہاتما گاندھی جی نے اُس خط کے ایک فقرے سے بحث کی ہو جو ان کی خدمت میں ایک خاص معاملے کی نسبت لکھا گیا تھا۔ وہ فقرہ یہ ہو:-

"گزشتہ زمانے میں مسلمانوں نے ہندی زبان کی تحصیل کی اور اسے ادبی زبان بنانے میں ہندو بھائیوں سے زیادہ نہیں تو اُن کی برابر کوشش کی۔ لیکن بات یہ ہو کہ اُس زبان کے ساتھ مذہبی اور کلچرل (تہذیبی) لوازمات ایسے وابستہ ہو گئے ہیں کہ مسلمان بحیثیتِ مجموعی اُن سے اپنے کو متحد و منسلک نہیں کر سکتے۔"

اس اقتباس کو پیش کر کے وہ دریافت کرتے ہیں کہ "اگر گزشتہ زمانے میں مسلمان ہندی کا مطالعہ کرتے تھے اور اس کی ترقی میں انھوں نے مدد دی تو آج کل مسلمان اس سے کیوں بھاگتے ہیں؟" اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھ گئے ہیں۔ لیکن انھیں سوچنا چاہیے تھا کہ کیوں ایسا ہوا؟ یہ گاندھی جی کے غور کرنے، سوچنے اور تحقیق کرنے کی بات ہے۔ اس کا ایک صاف اور سیدھا جواب یہ ہے کہ یہ ہندی وہ ہندی نہیں رہی۔ ہم ہندی سے نہیں بھاگتے، ہندی ہم سے بھاگ گئی ہے۔ جس ہندی کو ہم نے پڑھا، لکھا اور بڑھایا وہ ہماری زبان کا جزو اعظم ہے اور اب بھی ہمارے پاس اس کا اس قدر ذخیرہ ہے کہ خود ہندی میں نہیں۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "کوئی وجہ نہیں کہ کوئی شخص کسی زبان سے محض مذہبی اور تہذیبی لوازم کی وجہ سے احتراز کرے۔" فرماتے ہیں "کیا میں فارسی عربی سے اس وجہ سے احتراز کروں کہ وہ مسلمانوں کے مذہبی اور کلچرل خیالات سے بسی ہوئی ہیں؟ گاندھی جی نے یہاں مذہب اور کلچر کی بحث چھیڑ دی ہے جو نفس معاملہ سے غیر متعلق ہے۔ خط کے کاتب کا ہرگز یہ مطلب نہیں جو گاندھی جی سمجھے ہیں یا جو گاندھی جی نے بیان کیا ہے۔ کسی زبان کی تحصیل یا مطالعہ ایک چیز ہے اور اُسے مادری زبان بنا لینا یا مادری زبان کی طرح اختیار کرنا بالکل دوسری چیز ہے۔ مہاتما جی نے ان دو باتوں کو گڈ مڈ کر کے مغالطہ پیدا کر دیا ہے اور ایسا نتیجہ نکالا ہے جس سے کاتبِ خط قابل الزام ٹھہرتے ہیں حالاں کہ حقیقت اس کے خلاف ہے۔

اُس خط کا لُب لباب یہ ہے کہ ہمیں ملک کی زبان ہندستانی قرار

دینی چاہیے جیسا کہ نیشنل کانگریس نے تجویز کیا ہی چناں چہ اس بنا پر ہم نے اِس لفظ کو اپنی زبان کے لیے لکھنا شروع کر دیا ہی اور اپنی زبان کو سہل اور سلیس بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اُردو کے متعلق اِس خط میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہی کہ "اِس وقت صرف اُردو ایک ایسی زبان ہی جو کسی صوبے یا مذہب سے وابستہ نہیں۔ ہندستان بھر میں مسلمان یہ زبان بولتے ہیں اور شمالی ہند میں اُردو بولنے والے ہندوؤں کی تعداد مسلمان اُردو دانوں سے زیادہ ہی۔ اگر ہم اپنی مشترکہ زبان کو اُردو نہیں کہہ سکتے تو کم سے کم اس کا نام ایسا ہونا چاہیے جس سے معلوم ہو کہ اِس کے بنانے میں مسلمان بھی شریک ہیں اور وہ (دونوں قوموں کی) مشترک زبان ہی۔ لہذا ہندستانی اس منشا کو پورا کر سکتی ہی۔ ہندی اس سے قاصر ہی"۔ اِس کے بعد اوپر والا وہ فقرہ ہندی کے متعلق ہی جسے گاندھی جی نے نقل کیا ہی۔ اس فقرے میں تاریخی اشارہ ہی اِسے نفرت و الفت سے بحث نہیں۔ اِس سے بڑھ کر دوسری تاریخی حقیقت یہ ہی کہ اُردو فی الحقیقت مشترکہ زبان ہی ہندو مسلمان کی متحدہ اور متفقہ کوشش سے بنی ہی۔ کسی نے بنائی نہیں۔ حالات نے بنائی اور قدرت سے بن گئی۔ ہندی فارسی دونوں کے عنصر اس میں موجود ہیں۔ ہندو مسلمان دونوں کے خط و خال اس میں نظر آتے ہیں ہندی کے الفاظ اور محاورے فارسی عربی کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں۔ ہندستان کی اگر کوئی مشترکہ زبان ہو سکتی ہی تو یہی ہی لیکن حالات بدل گئے ہیں۔ لوگ حقیقت اور واقعیت کو نظر انداز کرتے جاتے ہیں۔ بہرحال اِس سے درگزر کی جاتے تو اِس کے بعد "ہندستانی" کا درجہ ہی جس کے تسلیم کرنے میں کسی معقول پسند شخص کو عذر نہ ہونا چاہیے اور ہندی اور اُردو پر اُسے فضیلت یہ ہی کہ اس کا تصور تمام غلط فہمیوں سے پاک ہی جو ایک معترض یا نکتہ چیں ہندی یا اُردو میں پیدا کر سکتا ہی۔

لیکن زمانۂ حال کے پالیٹکس نے جس میں مذہب کی پُٹ معمول سے زیادہ دی گئی ہو اچھے اچھے روشن خیال اصحاب کو سیدھے راستے سے بھٹکا دیا ہو۔

یہ مہاتما گاندھی سے بالکل متفق ہوں کہ ہمارا مقصد کوئی نئی زبان بنانا نہیں بلکہ اِن تین زبانوں میں سے کوئی ایک زبان اختیار کرنا ہو جو ملک میں رائج ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہو ان تینوں میں سے کون اختیار کرنے کے قابل ہو۔ اِن تینوں میں سے اگر کوئی مشترکہ زبان کہے جانے کی مستحق ہو سکتی ہو تو وہ "ہندستانی" ہو۔ پرشد کے جلسے میں خود گاندھی جی نے ہندستانی کی دو جُدا جُدا تعریفیں کی تھیں۔ ایسی حالت میں "ہندی یعنے ہندستانی" بے معنی ہو جاتا ہو اور اس کے بعد اس کا یہ کہنا کہ "میرے لیے دونوں برابر ہیں"، کہاں تک صحیح ہو سکتا ہو؟

گاندھی جی پرشد کے رسالے "ہنس" کی زبان کو کٹھن نہیں بتلاتے اور مسٹر کنہیا لال منشی کی تائید میں فرماتے ہیں کہ "مثلاً تامل، تلنگی کے مضامین کے ترجموں میں سنسکرت کے الفاظ لانا ناگزیر ہیں جیسے عربی کے ترجمے میں عربی الفاظ سے بچنا ممکن نہیں"۔ یہ صحیح ہو کہ ادبی اور علمی تحریروں میں مشکل الفاظ ضرور آجاتے ہیں۔ لیکن ہنس کی معمولی تحریریں بھی دوسرے ہندی رسالوں کی زبان سے مشکل ہوتی ہیں۔ ماہ حال کا ہنس میرے سامنے ہو، کھولتے ہی تیسرا صفحہ نکلا۔ اُس کا ایک مقام نقل کرتا ہوں۔ جو نہ سنسکرت، تامل، تلنگی یا کسی دوسری زبان کا ترجمہ ہو اور نہ کوئی علمی مضمون ہو۔ وہ عبارت یہ ہو:۔

"برج بھاشا پرم پراسے پراپت باہیہ اوم آنترک
روپوں، دینجنا ودھی، شبد بھانڈار، بھاؤ آدمی، کو انھوں نے

اپنایا۔ یدپی آگے چل کر اُنھوں نے گدیہ میں اپنے وچار ویکت کرنے کے لیے کھڑی بولی کو انگیکار کیا، تتھاپی کوتا انھوں نے پردھانتیہ برج بھاشا میں لکھی۔ اس میں سندیہ نہیں کہ اِنھیں جو برج بھاشا ہندی کاویوں کے دُوارا اپلبدھ ہوئی تھی، اُس پرچلِت شبدوں کی توڑ موڑ اپرچلِت، پرانت تتھا گرامیہ پریوگوں کی ابھرچی جیسی اس بھاشا کے سوابھاوِک وکاس میں بادھک سو چھند تاؤں کا پرشکار کیا اور کاویہ بھاشا کو سادھو، سویستھت اور سو سنسکرت روپ کو بڑا مہتو پوڑن بھاشا سنکار کا کاریہ کیا۔"

کیا اسی کو مہاتما گاندھی ہندی یعنی ہندستانی کہتے ہیں؟ اور کیا اسی زبان کو ہندو مسلمانوں کی زبان بنانا چاہتے ہیں؟

اِن کا یہ فرمانا کہ ہندی ہندستانی اور اُردو ایک ہی زبان کے مختلف نام ہیں کیوں کر درست ہو سکتا ہو جب کہ خود انھوں نے اُردو تو اُردو تنہا ہندستانی کا لفظ بھی اپنے رزولیوشن میں رکھنا گوارا نہیں کیا اور ہندی کے لفظ کو اُس کے ساتھ بلا وجہ جوڑنے پر اصرار کرتے رہے۔ اگر حقیقت میں یہ بات ہوتی جو وہ کہتے ہیں تو سرے سے اس بحث کی ضرورت نہیں تھی۔ اصل بات یہ ہو کہ ہندستانی کے لفظ سے اُنھیں یہ اندیشہ لگا ہوا تھا کہ کہیں کوئی ہندستانی کے معنی اُردو نہ سمجھ لے۔ اور دل کی بات زبان پر آہی جاتی ہو وہ ایک بار اپنی گفتگو میں اس کا اظہار بھی کر گئے۔

آگے چل کر فرماتے ہیں کہ "اگر میرا بس چلے تو میں ان کو (یعنے مجھے

اور عاقل صاحب کو) اُردو کو مخصوص مسلمانوں کی اور ہندی کو مخصوص ہندوؤں کی زبان خیال کرنے سے باز رکھوں۔ اگر اِن میں سے کوئی بھی باز نہ آئے تو شمالی ہند کے مسلمانوں اور ہندوؤں کی کوئی مشترکہ زبان نہیں ہو سکتی۔" ہم مہاتما جی کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم ہرگز اُردو کو مسلمانوں کی مخصوص زبان نہیں سمجھتے اور نہ وہ فی الحقیقت ہے۔ مہاتما جی کے لیے ناگ پور میں مشترکہ زبان قائم کرنے کا بڑا اچھا موقع تھا۔ لیکن یہ موقع خود انھوں نے اپنے ہاتھ سے کھو دیا۔ اب سب کچھ کرنے کے بعد منطقی تصریحات سے لیپ پوت کرنا بے محل اور بعد از وقت ہے۔

اِس کے بعد فرماتے ہیں کہ "نام میں کیا رکھا ہے، اس پر جھگڑنا فضول ہے۔ جب مطلب ایک ہے تو نام کچھ بھی ہو۔" گاندھی جی کو یاد نہیں رہا کہ نام کا جھگڑا خود انھوں نے پیدا اور اس جھگڑے کو اخیر تک قائم رکھا اور افسوس تو یہ ہے کہ نام بھی ایک نہیں اور مطلب بھی ایک نہیں۔ اور نام میں کیوں نہیں کچھ رکھا۔ نام میں بہت کچھ رکھا ہے۔ مثلاً گائے کا لفظ ہے۔ لغت میں دیکھیے اس کے معنے بیل کی مادہ کے ہیں۔ لیکن مہاتما جی اور کوئی ہندو بزرگ جب اِس نام کو اپنی تقریر میں لیتے ہیں تو اُس وقت وہ بیل کی مادہ نہیں رہتی۔ اُس وقت انھیں اپنے سامنے تقدّس، عظمت، محبت، شفقت، تعصب، توہمات اور نہ معلوم کن کن جذبات کے پرے کے پرے جمے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بیل یا بھینس کے نام سے کبھی یہ جذبات اُن پر طاری نہیں ہوتے۔ اِسی سے خیال کر لینا چاہیے کہ جس وقت مہاتما گاندھی پرشد کے جلسے میں بار بار ہندستانی یا اُردو کے مقابلے میں ہندی ہندی فرماتے تھے تو اُس وقت اس لفظ

کے تلفظ کے ساتھ کون کون سے جذبات اُن کے دماغ میں گھوم رہے تھے.
بات یہ ہو کہ اِس مسئلے میں بحث کی گنجایش ہی باقی نہیں رہی.
جب کہ مہاتما جی نے پرشد کے جلسے میں صاف صاف یہ فرمادیا کہ مَیں
ہندی سمیلن کو نہیں چھوڑ سکتا مجھے اس کے ساتھ ساتھ چلنا ہو اور
خصوصاً جب انھوں نے فیصلے سے قبل یہ کہ دیا تھا کہ ہم یہ فیصلہ کر چکے ہیں
تو پھر یہ تمام جھک جھک اور بک بک اور ووٹ بازی لاحاصل تھی۔ بہرحال
ہم نے اپنی طرف سے مصالحت کی پوری کوشش کی مگر وہ ردکر دی گئی۔ اب
ہم الزام سے بَری ہیں اور یہ تحریر کسی کی مخالفت میں یا کسی کو الزام دینے
کے لیے نہیں لکھی گئی بلکہ صرف اپنی بریت کے لیے لکھنی پڑی ہو۔"

اُردو دیر و حرم کی قید سے آزاد اور کیش و ملّت کے بکھیڑوں سے
بری ہو۔ وہ نہ ہندو ہو اور نہ مسلمان بلکہ ڈاکٹر سر سپرؤ کی زبان میں یہ
تو ہمارے اسلاف کا وہ ترکہ ہو جو قطعاً ناقابلِ تقسیم ہو۔ چناں چہ ڈاکٹر مولوی
عبدالحق صاحب کی تحریریں رنگ لائے بغیر نہ رہ سکیں۔ بابو سندر لال صاحب
جن کا مرتبہ کانگریس میں مسلّم ہو اور جن کی حق گوئی اور حق پرستی کے اپنے
بیگانے سب معترف ہیں۔ گاندھی جی کو یہ خط لکھتے ہیں:۔

بابو سُندر لال صاحب کا خط مہاتما گاندھی کے نام

پہلی اگست کے ہریجن سیوک میں مَیں نے آپ کا لیکھ (مضمون) غلط فہمیوں
کی گُتھی پڑھا تھا۔ اسی وقت آپ کو کچھ لکھنے کا خیال ہوا تب سے اب
تک کئی بار یہ خیال ذہن میں آیا۔ لیکن کئی سببوں سے سنکوچ (جھجک) کرکے
رہ گیا۔ حال میں ایک دوست نے مجھے لاہور کے اردو روزانہ انقلاب کا

۳۰ مئی کا پرچہ لاکر دیا جس میں اکھل بھارتیہ پرشد کے ناگ پور اجلاس کے بارے میں مولانا عبدالحق کا لمبا خط چھپا ہے، ظاہر ہے یہ خط آپ نے دیکھا ہو اور جن کترنوں کو سامنے رکھ کر آپ نے اپنا لیکھ (مضمون) لکھا ہے۔ ان میں یہ خط بھی ہوگا۔ محض اپنا فرض سمجھ کر میں آج یہ لمبا خط لکھ رہا ہوں، آپ کے لیکھ (مضمون) کے نیچے لکھی ہوئی باتوں کی طرف میں آپ کا دھیان دلانا چاہتا ہوں۔

(۱) "اُردو نام خاص طور سے اور خاص مطلب سے رکھا گیا" یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔ اُردو زبان کی تاریخ سے صاف پتا چلتا ہے کہ یہ نام اسی طرح خود بہ خود اس سے پہلے کی ہندی یا ہندوئی کے ساتھ بہت سے ایسے عربی، فارسی، ترکی شبدوں (لفظوں) اور محاوروں کے میل سے بنی ہوئی زبان کے لیے رائج ہونے لگا جو لشکری لوگوں میں بولے جاتے تھے۔ یہ سلسلہ بالکل قدرتی تھا کسی بھی خاص مطلب سے کسی نے یہ نام نہیں رکھا تھا۔ اس کے بعد عرصے تک اس نئی ملی جلی اور مروجہ زبان کے لیے ہندی اور ہندوی شبد (لفظ) بھی استعمال ہوتے رہے، یہ دونوں نام بھی مسلمانوں ہی کے رکھے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں ہی نے پہلے پہل اس زبان کو جو اُن سے پہلے ہندستان کی راج دھانی کے آس پاس بولی جاتی تھی، ہند سے ہندی یا ہندوی کہنا شروع کیا۔ اسے اپنایا اور اسے ترقی دی۔ بعد میں جب اس زبان میں فارسی، عربی، ترکی سے کچھ شبد (لفظ) اور محاورے مل کر اس کا رُوپ (شکل) بدلا تو ہندی نام کی جگہ صرف اُردو نام کا استعمال ہونے لگا، یہ بھی ایک قدرتی چیز تھی۔ آپ جانتے ہی ہیں فارسی میں (اُردو) لشکر یا لشکرگاہ کو کہتے ہیں۔ اسی سے دلّی میں اُردو بازار تھا جہاں اس نئی زبان نے شکل

اختیار کی مشہور شاعر غالب نے ۱۸۵۷ء کے بعد کی دلّی کی بربادی کو بیان کرتے ہوئے اپنے ایک خط میں لکھا ہے۔ "دلّی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہتے چلے جاتے ہیں واہ رے حُسنِ اعتقاد، ارے بندۂ خدا! اُردو بازار نہ رہا، اُردو کہاں، دلّی کہاں، واللہ اب شہر نہیں ہے کیمپ ہے، چھاؤنی ہے۔"

(۲) ہندی اور اُردو اِن دونوں شبدوں کا جنم کبھی بھی اور کسی طرح ہوا ہو اور اُن کے مصدری معنی کچھ بھی ہوں، اِس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ آج یہ دونوں نام ہندستانی زبان کی دو الگ الگ شکلوں کے لیے استعمال ہو رہے ہیں اور اِن کے دو صاف صاف الگ الگ مروّجہ معنی ہیں۔ ایسی صورت میں جو لوگ ان دونوں شکلوں کو پھر سے ملا کر ایک زبان بنانا چاہتے ہوں انھیں کسی تیسرے نام کا سہارا لینا ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں اس سچائی کو محسوس کر کے بھی آپ نے خود کچھ سال پہلے "ہندستانی" لفظ کو استعمال کیا تھا اور ملک کو سکھایا تھا۔ پھر اب وہ حالت بدل گئی۔

(۳) آپ کے یہ الفاظ پڑھ کر "اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ وے (یعنی اُردو والے) بھاشا (زبان) کا ویاکرن (قواعد) بھی بدل دیتے ہیں" مجھے اور بھی دُکھ اور حیرانی ہوئی پچھلے پانچ سات سو برس کے اندر اندر کی ہندستانی زبان کی مختلف شکلوں پر جتنی اچھی کھوج (تحقیق) گزشتہ تیس سال میں مولانا عبدالحق نے کی ہے شاید کسی دوسرے نے نہیں کی۔ اِس کے علاوہ اگر آپ اُردو ہندی دونوں کے ودوان (عالم) منشی پریم چند سے دریافت کر لیتے تو آپ کو معلوم ہو جاتا کہ اصلیت اس سے ٹھیک برعکس ہے۔ مجھے خود کم سے کم اٹھائیس برس سے آج کل کی اکثر ہندی (اس شبد (لفظ) کا استعمال میں مروّجہ ہی معنے میں کر رہا ہوں) مصنفوں

سے اس معاملے میں کافی شکایت ہو۔

شاید آپ کے دھیان میں یہ بات نہیں ہو کہ اِس وقت کی کتابی ہندی ہندستان کے کسی بھی ضلع یا نگر یا گاؤں کی بول چال کی زبان نہیں ہے۔ الہ آباد کے تعلیم یافتہ سے تعلیم یافتہ پنڈت (کاشمیریوں کو چھوڑ کر) جب اپنے گھروں میں بات چیت کرتے ہیں "ہمرے دوارے ایک مہرارو کھڑی با" (یعنی ہمارے دروازے پر ایک عورت کھڑی ہے) بنارس کے پنڈت تو اور بھی عجیب زبان بولتے ہیں۔ جس کو نہ میں سمجھتا ہوں نہ لکھ سکتا ہوں۔ اِن الہ آبادی اور بنارسی زبانوں کا بیاکرن (قواعد) ہندی یا اُردو کے قواعد سے بالکل ایک مختلف چیز ہے۔ کشمیری بلا شبہ خالص ہندستانی بولتے ہیں۔ لیکن اگر ان کی بول چال کی زبان کو اُردو یا ہندی دونوں میں سے ایک نام دینا پڑے تو وہ اُردو ہے ہندی نہیں۔ اگر آپ کسی اَن پڑھ کشمیری بڑھیا کو پکڑ کر اُسے کسی اُردو اخبار کا ایک کالم پڑھ کر سنائیں اور پھر اسی طرح کے مضمون پر کسی ہندی سماچار پتر (اخبار) کا ایک کالم سنائیں تو جتنا اُردو اخبار سے اُس کے پلے پڑ سکے گا اتنا ہندی سماچار پتر سے نہیں پڑے گا۔ برخلاف اس کے آج کل کی اُردو بلا شبہ کچھ مقاموں کی بول چال کی زبان ہے۔ لکھنؤ، دلّی، مرادآباد، میرٹھ کی مہترانیاں بھی خالص اُردو بولتی ہیں۔ لکھنؤ اور دلّی کی زبانوں میں بھی فرق ہے۔ لیکن وہ اتنا باریک ہے کہ بڑے سے بڑے ودیشی یا دیگر صوبے کے بڑے سے بڑے عالم بھی کبھی کبھی اُسے نہیں پکڑتے۔

آپ کی اجازت سے میں اپنے ہی گھر کی مثال دینا چاہتا ہوں۔ میری دادی 'مہابن' کی رہنے والی تھیں جو 'برج' کا مرکز ہے اور اَن پڑھ

تھیں۔ ماں دلّی کی تھیں صرف ناگری حرُوف پڑھ سکتی تھیں۔ میرے گھر میں ٹھیک یہی زبان بولی جاتی تھی، جس میں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ بعض دو باتوں میں فرق تھا ایک تو سنسکرت شبدوں کی جگہ اُردو فارسی کے زیادہ عام فہم الفاظ تھے اور دوسرے وہ زبان زیادہ بامحاورہ تھی، میری زبان اِدھر اُدھر گھومنے اور ہر طرح کی چیز پڑھنے کی وجہ سے کھچڑی ہو گئی ہے۔ میری اَن پڑھ دادی لرن نہیں سمجھتی تھیں۔ قرضہ سمجھتی تھیں۔ بُڑھائی کی بجائے اُن کی زبان پر مبارک باد زیادہ چڑھا ہوا تھا۔ ادمی، منش، جیو، پرتھوی، وشا وغیرہ کی جگہ آدمی، زبان، زمین اور حالت لفظوں کا استعمال کرتی تھیں۔ یہی زبان میری ماں کی زبان تھی۔

اگر اُردو اور ہندی کو دو الگ الگ زبانیں شمار کریں تو یہ بات بالکل سچی ہے کہ ہندی کہیں کی بھی بول چال کی زبان نہیں ہے، اُردو ہے۔ یہاں میرا مطلب کھڑی بولی ہندی سے ہے۔ برج بھاشا یا اودھی تو ویاکرن (قواعد) کے خیال سے ہندی اُردو سے بہت دُور ہیں۔ اِسی لیے مولانا عبدالحق نے ناگ پور میں آپ سے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ اُردو زبان میں ہندی کے الفاظ اور محاورے جس کثرت سے ہیں خود ہندی زبان میں اِس قدر نہیں ہیں۔ یہ بھی بالکل سچ ہے کہ آج کل کی ہندی زیادہ تر کتابی اور بناوٹی زبان ہے۔ کچھ تو فرقہ وارانہ جذبہ اور زمانۂ قدیم کی طرف جانے کی خواہش، کچھ ایک قومی زبان تعمیر کرنے کا خیال، اور کم سے کم شروع میں ایک حد درجہ حکّام کے خود غرضانہ اشارے اور اُن کی مدد، اِن تمام چیزوں کے سہارے پچھلے تیس چالیس سال سے ملک میں رائج کی جا رہی ہے۔ اس کے مقابلے میں اُردو ایک زیادہ قدرتی اور

زندہ زبان ہو۔ ہیں دونوں اِس ملک کی پیدائش، رہا سوال بیاکرن (قواعد) کا،
آج کل کی ہندی کو اپنا بیاکرن اور ڈھانچا ظاہر ہو اودھی سے لینا پڑا۔ اودھی
یا برج بھاشا ایک آٹھ سو سال پہلے کی ہندی سے نہ تو اپنا ویاکرن لے سکتی
ہو اور نہ وہ چل سکتا ہو، اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ اس وقت اُردو اور
ہندی کا بیاکرن (قواعد) اور ڈھانچا ایک ہی ہو اور ایک ہی ہونا چاہیے۔
اور اس سے کبھی آیندہ ایک ہندستانی زبان کے جنم کی امید ہو سکتی ہو لیکن
ہندی کے کچھ ایسے ودوان (عالم) جو گھروں میں الہ آبادی، بنارسی،
اودھی وغیرہ بولتے ہیں، یعنی جن کی مادری زبان اُردو ہو نہ ہندی، کئی
طرح سے ہماری اس ہندستانی زبان کے بنے بنائے ویاکرن کو خراب
کر رہے ہیں مثلاً تذکیر و تانیث میں یہ لوگ اکثر سنسکرت لغت سے
شبدوں کی تذکیر و تانیث کا پتا لگا کر ہندی میں اسی طرح رائج کرنے
کی خلافِ قدرت کوشش کرتے ہیں، اور بھی کتی چیزیں ہیں لیکن میں
ان کی وضاحت میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لینا چاہتا۔ یہ لوگ بھول
جاتے ہیں کہ ہماری زبان ایک اعلا زندہ زبان ہو جو ہزاروں سال
میں آہستہ آہستہ اس روپ تک آئی ہو اور آیندہ بھی بدلے گی۔ لیکن
سنسکرت وہ نہیں ہو نہ اُس کا ویاکرن سنسکرت ویاکرن ہو۔ سنسکرت میں
تین وچن (صیغے) ہیں ہندی میں دو، سنسکرت میں ماتا اور پتا دونوں کے
لیے ایک (گچھتی) سے کام چل جاتا ہو۔ ہندی میں ہم دو علاحدہ علاحدہ
فعل استعمال کرتے ہیں۔ وغیرہ۔

ہاں کچھ مصنّف ہر زبان کے ایسے ضرور ہوتے ہیں جو ویاکرن کے
قاعدوں سے بندھنا نہیں چاہتے۔ ان میں کچھ اعلا مرتبے کے ہوتے ہیں

جنھیں ایسا کرنے کا اختیار بھی دیا جا سکتا ہو۔ مثلاً ہندی میں مرحوم بال کشن
کرشن بھٹ۔ لیکن اگر یہ قصور ہو تو مجھے جہاں تک معلوم ہوتا ہو ہندی
یا اُردو کا کوئی قدیم یا حال کا ادیب اس معاملے میں شاید اتنا قصوروار نہ
ہو جتنا مرحوم بھٹ جی۔

اُردو کے بہت سے ادیب اُردو لفظوں کی فارسی عربی جمع کا استعمال
ضرور کرتے ہیں۔ یہ رواج اتنا ہی غلط کہا جا سکتا ہو جتنا ہندی میں سیک
روپین لکھنا یا پاخانے کی جگہ سوچالیہ لکھنا۔ میں یہ بھی عرض کر دوں
کہ اُردو میں فی زمانہ کافی ادیب اِس طرح کے ہیں جو اِس رواج کی
کھلی مخالفت کرتے ہیں لیکن پھر بھی وکیلوں کی جگہ وکلا لکھنے سے ہما
ویاکرن (قواعد) اتنا نہیں بدلتا جتنا وایو (ہوا) بہ رہی ہو کی جگہ و
بہ رہا ہو کہنے سے اس لیے کیوں کہ سنسکرت میں وایو مذکر ہو۔

(۴) آپ نے لکھا ہو "مولوی عبدالحق صاحب نے ہندی ہندستا
کے بجائے صرف ہندستانی یا ہندی اُردو کے پیریوگ (استعمال) کا پر
(لحاظ) رکھا تھا۔ مجھے تو ان دونوں میں کوئی اعتراض نہیں ہو۔ لیکن
بھارتی ساہتیہ پرشد اپنے جنم (پیدائش) کو نہیں بھول سکتا ...... ا
لیے شبد (الفاظ) کا رکھنا ضرور ہو گیا"۔

اگر بھارتی ساہتیہ پرشد ہندی ساہتیہ سمیلن کا ایک بچہ ہو اور ا
طرح سے کام کرنا چاہیے تو آپ کی باقی بات تو ٹھیک ہو۔ پھر بھی غنیم
ہو کہ آپ کے اثر سے انھوں نے محض "ہندی" کی جگہ ہندی ہندستا
رکھنا منظور کر لیا اور اگر جس زبان میں وہ استعمال کریں وہ بیچ ہندستان
کے کچھ نزدیک آوے تو خوش قسمتی کی بات ہو گئی۔ لیکن مولانا عبدالحق

خط سے معلوم ہوتا ہو کہ کچھ غلط فہمی اس بارے میں ہوگئی، جو اُردو ادیب وہاں آئے تھے وہ غلط امیدیں باندھ کر آئے تھے۔ میں بڑے سنگوچ (جھجک) کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ شاید انھیں دعوت دینے میں بھی بے احتیاطی ضرور ہوئی۔ ملک کی بڑی ہی خوش قسمتی ہوتی اگر آپ کی رہ نمائی میں کوئی ایسی ہندستانی ساہتیہ پرشد قائم ہوسکتی جو اپنے رسالوں اور کتابوں میں ہندستانی زبان لکھنے کی کوشش کرتی اور جس کی چیزیں ناگری اور فارسی دونوں حروف میں نکل کر ہندی اور اُردو دونوں کے پڑھنے والوں کو آہستہ آہستہ ہندستانی زبان کی طرف لاتیں۔

باپو جی! میں نے عبدالحق صاحب کے خط اور آپ کے لیکھ (مضمون) دونوں کو ملا کر پڑھا۔ جو شکوک اِس خط سے پیدا ہوتے ہیں۔ آپ کے لیکھ (مضمون) سے وہ شک رفع نہیں ہوتے۔ میں آپ سے پرارتھنا (التجا) کروں گا کہ آپ پھر ایک مرتبہ اس خط کو دیکھیں اور اگر ہوسکے تو آپ بھی اِس کے شبہوں کو رفع کریں۔ جس طرح سے انھوں نے واقعات کو بیان کیا ہو اُس میں غلطی ہوسکتی ہو۔ ان کی رائے بھی تو کم سے کم میں تو ہر بات میں ماننے کو نہیں تیار ہوں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ خط دُکھے ہوئے دل سے اور نیک نیتی کے ساتھ لکھا گیا ہو۔ ان کے شکوک رفع ہونے چاہییں تھے۔ میں صرف ایک مثال دوں گا۔

اِس خط کے مطابق آپ نے کہا تھا "اُردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہو۔ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہو اور مسلمان بادشاہوں نے اِسے بنایا اور پھیلایا۔ مسلمان چاہیں تو اِسے رکھیں اور پھیلائیں۔"

اگر رزولیوشن میں تنہا ہندستانی کا لفظ رکھا گیا تو اس کا مطلب اُردو

سمجھا گیا۔ مجھے معلوم ہو کہ گجرات کے مسلمان اُردو کو اپنی مذہبی زبان کہتے ہیں۔ میں یہ بھی اندازہ کر سکتا ہوں کہ جب سے اُردو ہندی کا یہ بدقسمت جھگڑا چلا دوسرے صوبوں میں اُردو کے بہت سے مسلمان مبلّغ اُردو کو اپنی مذہبی زبان کہ کر اس کی تبلیغ کرتے ہوں گے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہو کہ یہ خالص ادبی سوال فرقہ وارانہ سوال بن گیا۔ لیکن اِن باتوں سے واقعات نہیں بدل سکتے۔ اُردو نہ مسلمانوں کی اور نہ کسی اور کی مذہبی زبان ہو اور نہ کبھی تھی، وہ محض اس ملک کے لاکھوں رہنے والوں کے حق میں ہندو، مسلمان، عیسائی اور جین سب شامل ہیں قدرتی اور مادری زبان ہو۔ اس کو ترقی دینے میں ہندوؤں نے اتنا ہی حصّہ لیا ہو جتنا مسلمانوں نے اور آج تک بہت سے ہندوؤں کو اس پر ایسا ہی فخر ہو جیسا کہ مسلمان کو ہوسکتا ہو۔ ہندی میں تو رامائن بھی ہو جسے کم سے کم شمالی ہند کے لاکھوں ہندو اپنی ویسی ہی مذہبی کتاب مانتے ہیں جیسی کسی دوسری کتاب کو۔ اُردو میں تو مسلمانوں کی کوئی اس طرح کی کتاب بھی نہیں ہو۔ آپ کو شاید معلوم ہو کہ بہت سے کٹّر مسلمان مولویوں کو قرآن کو اُردو میں ترجمہ ہونے پر سخت اعتراض تھا اور کچھ کو آج تک ہو۔ آپ کو شاید یہ بھی معلوم ہو کہ شمالی ہند میں کم سے کم ہزاروں ہندو گھر ابھی تک ایسے ہیں جہاں دسہرے کے دن پوجا کے وقت برہما اور پچھم کا گھوڑا، آٹر کا تیر، دکھن کا چیر یا ان سے ملتے جلتے الفاظ کاغذ پر اُردو حروف میں لکھے جاتے ہیں۔ اب اگر اس طرح کے لوگوں کو دھرم سے گرا ہوا کہہ کر علاحدہ کر دیا جائے یا مہلک تنگ خیالی کے اثر میں ہم ان طریقوں کو بدلنے کی کوشش کریں تو وہ دوسری بات ہو۔

یہ بھی ٹھیک نہیں ہو کہ اُردو قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہو۔ اگر ہم اُردو کو قرآن کے حرفوں میں لکھنے کی کوشش بھی کریں تو معمولی حرفوں کی شکلیں تو کافی بدل جاوَیں گی۔ ہمیں پڑوسی کو فروسی لکھنا پڑے گا۔ چاند کو جاند اور گلے کو کاے یا غاے، کھانا کو کانا وغیرہ آج کل کے فارسی حروف جن میں ہندستانی آوازوں کو ظاہر کرنے کے لیے کچھ نئی علامتیں جوڑکر اُردو لکھی جاتی ہو عربی حروف (خط نسخ) سے صدیوں پہلے کی ایجاد ہیں۔ دونوں میں تو مشابہت بھی ہو۔ لیکن مشابہت تو گجراتی، بنگلا اور ناگری حرفوں میں بھی کافی ہو۔ آوازیں تو بالکل وہی ہیں۔ اِس کی بنا پر یہ کہنا تو شاید ٹھیک نہ ہوگا کہ گجراتی اور بنگالی رِگ وید کے حرفوں میں لکھی جاتی ہیں۔

یہ بات الگ ہی رہی کہ کسی خاص کتاب کے حروف میں لکھے جانے کی وجہ سے بھی کوئی زبان کسی خاص جماعت کی زبان نہیں بن جاتی۔

اوپر کے اقتباس کی باقی باتیں بھی اِسی طرح حقیقت کے خلاف ہیں۔ اُردو ادب سے واقف اور اُس کے پریمیوں میں خوش قسمتی یا بدقسمتی سے تھوڑے بہت ہندو تک بھی ہیں۔ جنھیں اس بات پر قدرتی دُکھ ہوتا ہو کہ اس ہندی، اُردو کے سوال کو بھی خالص فرقہ وارانہ شکل دی جاوے۔ آپ کی طاقت اس بارے میں بہت ہو اور میری عاجزانہ پرارتھنا (التجا) ہو کہ آپ اِس غلط میلان کو ہو سکے تو روکیں۔

اِس کے علاوہ شاید آپ کو معلوم ہوگا کہ اُردو کے مسلمان ادیبوں میں ایک خاصی تعداد ایسے لوگوں کی ہو جو دل سے آپ کے مقصد کی قدر کرتے ہیں اور اس کے مطابق عمل کرنے کرانے کی بھی کوشش کرتے

رہے ہیں۔ بہت سے ایسے ہیں جو اگرچہ اپنی اخلاقی کم زوری کے وقت یا کسی دوسری وجہ سے سیاسی تحریک میں مناسب حصّہ نہیں لے سکتے تاہم اپنے میدان میں قومی اتحاد کو قائم کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے میں جی جان سے کوشش کرتے رہے ہیں۔ اُردو رسالوں میں وِدوان (عالم) مسلمان مصنّفوں کے لیکھ اس مضمون کے برابر نکلتے رہے ہیں کہ ہمیں اُردو سے فارسی اور عربی کے غیر مانوس شبدوں (لفظوں) کو نکال کر ہندی کے عام فہم شبدوں کا استعمال کرنا چاہیے۔ ایک مسلم اُردو رسالے کی زبان پر کسی کٹر مسلمان نے اعتراض کیا۔ آپ کو تعجب ہوگا۔ وِدواں (ذی علم) اڈیٹر نے جواب دیا۔ "مَیں حجازی اُردو سے اپنے رسالے کو ناپاک نہیں کرنا چاہتا" اس چیز پر عمل بھی جتنی کام یابی کے ساتھ آج کل اُردو رسالوں میں ہو رہا ہے کسی ہندی رسالے میں نہیں ہو رہا ہے۔ لاہور کے رسالہ نیرنگ خیال سے مَیں نے اُردو نظم و نثر دونوں کے کچھ نمونے اپنے دکھن بھارت ہندی پرچار سبھا مدراس کے کانووکیشن اڈریس میں نقل کیے تھے۔ جنھیں آپ اگر جوں کا توں ناگری حرفوں میں کسی ہندی رسالے میں شایع کرادیں تو کسی بھی پڑھنے والے کو یہ گمان بھی نہیں ہوسکتا کہ یہ اُردو سے لیے گئے ہیں۔ یہ سب مسلمانوں کے لکھے ہوتے ہیں۔ مجھے شک ہے کہ کسی ہندی رسالے سے شاید کوئی ایک نمونہ بھی ایسا نہیں نکالا جاسکتا جسے اگر جوں کا توں چھاپ دیں تو محض اُردو پڑھ سکنے والا اُسے پڑھ کر اُردو ہی سمجھے۔ آپ خود کسی وقت آیندہ کی ہندستانی زبان کے لحاظ سے سُندر (خوب صورت) ملی جلی زبان بولا کرتے تھے کہ جسے سُن کر اُردو داں اور ہندی داں دونوں کا دل خوش ہو جاتا تھا، دونوں سمجھتے تھے

لیکن ناگ پور کی جو آپ کی تقریر جوں کی توں دلی کے جامعہ میں چھپی ہو وہ وہ چیز نہیں ہو۔

مولانا سلیمان ندوی جیسے ودوان (عالم) جنھوں نے اپنے یوم النبی کی چھپی ہوتی تقریر میں بجائے حضرت محمد کے سوامی محمد لکھا ہو، برسوں سے زوروں کے ساتھ کھلے طور پر کوشش کر رہے ہیں کہ ہمیں نہ صرف اُردو کو سہل ہندستانی بنانا چاہیے بلکہ اُردو کی جگہ اِسے ہندستانی کہنا چاہیے۔ رسم الخط کا سوال علاحدہ ہو۔ ان قابلِ تعریف کوششوں کی کچھ جھلک آپ کو عبدالحق صاحب کے خط میں بھی مل سکتی ہو۔ یہ سب کافی حد تک آپ ہی کے پریم (محبت) اور حوصلہ افزائی کا نتیجہ تھا۔ مگر ناگ پور سے اب تک نہ جانے کیا ہوا بہت سے اس طرح کے سچے اور سنجیدہ مسلمان کام کرنے والوں کے دل بھی شکوک اور مایوسی سے ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے ہیں جو اپنے دکھ کو اپنی زبان تک بھی لانا نہیں چاہتے۔

خط بند کرنے سے پہلے رسم الخط کی بابت اپنا خیال آپ کے سامنے رکھ دوں۔ بہت دنوں سے لوگ رومن رسم الخط کے حق میں ہیں، مثلاً بابو راجندر جی وغیرہ۔

میں ۱۹۳۶ء کے شروع تک اس کے خلاف رہا۔ لیکن اب کچھ رائے بدلتی جا رہی ہو دلیلوں میں آپ کا وقت ضائع نہ کروں گا۔"

گاندھی جی نے "اکھل بھارتیہ پریشد" کے اجلاس ناگ پور میں اُردو کے بارے میں جو عجیب و غریب انکشافات کیے تھے اس کے فیوض و برکات اگر کہیں اور نہیں تو صوبۂ متوسط و برار میں وقت سے پہلے ظاہر ہونے لگے۔ ۱۹۳۷ء کے وسط میں صوبۂ مذکور میں کانگریسی وزارت قائم ہوئی۔ تعلیم کا قلم دان

شکلا جی کے سپرد ہوا - پنڈت جی نے وزارت کی گدّی پر بیٹھتے ہی پورے صوبے کے لیے "ودیا مندر" کے نام سے ایک تعلیمی اسکیم مرتّب کرنے کا اعلان کیا۔ ابھی اسکیم چھپی نہیں تھی لیکن شکلا جی نے اس وقت تک اس کے متعلق جو تصریحات بھی کی تھیں اُن سے شبہہ ہوتا تھا کہ کہیں یہ اسکیم صوبۂ متوسط و برار میں اُردو کے لیے پیامِ موت نہ ثابت ہو - اس موقع پر بھی ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے بروقت توجہ فرمائی ۔ اس خیال سے کہ فتنے کا سدِّ باب شروع ہی میں کر دیا جائے ۳۰ ستمبر ۱۹۳۷ء کو آپ نے انجمن ترقیٔ اُردو ناگ پور کے ایک وفد کے ساتھ وزیر اعظم مسٹر کھرے اور وزیر تعلیم شکلا جی سے ملے - صدرِ وفد ہونے کی حیثیت سے آپ نے پنڈت جی سے گفتگو فرمائی - آپ ہی کے الفاظ میں ذیل میں درج کی جاتی ہے -

مسٹر شکلا وزیر تعلیم صوبۂ متوسط سے گفتگو

(۳۰ ستمبر ۱۹۳۷ء)

بہار کمیٹی سے فارغ ہو کر میں ناگ پور پہنچا اور صوبہ متوسط (سی۔ پی) کے وزیر اعظم مسٹر کھرے اور اس کے بعد خان بہادر حافظ ولایت اللہ صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی، سابق ڈپٹی کمشنر اور نواب محی الدین خاں صاحب ایم۔ ایل۔ اے کی معیت میں مسٹر شکلا وزیر تعلیم سے ملاقات کی ۔

وزیر تعلیم سے جن امور پر گفتگو ہوئی وہ حسب ذیل ہیں -

(۱) صوبۂ متوسط میں پرائمری مدارس کے لیے اُردو ریڈروں کے متعدد سلسلے منظور کیے گئے ہیں اور اس لیے مختلف مدارس میں مختلف سلسلے پڑھائے جاتے ہیں حالاں کہ دوسری زبانوں کے لیے ریڈر کا ایک ہی سلسلہ ہے - یہ مناسب معلوم ہوتا ہے

کہ سارے صوبے کے لیے اُردو ریڈروں کا ایک ہی سلسلہ منظور کیا جائے ۔

اُردو ریڈروں کے موجودہ طریقے سے بہت سی دشواریاں پیش آتی ہیں خصوصاً جب طالب علم کو ایک مدرسہ چھوڑ کر کسی دوسرے مدرسے میں داخل ہونے کی ضرورت پڑتی ہو ۔ یا جب امتحان کے پرچے میں یہ تلاش کرنا پڑتا ہو کہ سوالات مندرجہ پرچہ میں کون سے سوالات ان ریڈروں سے تعلق رکھتے ہیں جو اُس نے اپنے مدرسے میں پڑھی ہیں ۔ اس سے طالب علم کی پریشانی کا اندازہ ہو سکتا ہو ۔

(۲) میونسپل حلقوں کے اکثر سپرنٹنڈنٹ تعلیم اُردو سے ناواقف ہیں ۔ اس وجہ سے ایسے حلقوں کی اُردو تعلیم ناقص رہ جاتی ہو یہ مناسب معلوم ہوتا ہو کہ انسپکٹروں کے لیے اُردو کا جاننا بھی ایک ضروری شرط قرار دیا جائے ۔

(۳) ہماری رائے میں یہ مناسب معلوم ہوتا ہو کہ تمام اُردو پڑھنے والے طلبا کے لیے ہندی کا جاننا اور ہندی خواں طلبہ کے لیے اُردو کا جاننا لازمی قرار دیا جائے ۔ مڈل اسکولوں میں اس طریقے کا رائج کرنا زیادہ مناسب ہوگا ۔

(۴) ابتدائی تعلیم کے لیے اس صوبے میں جو نیا طریقہ یا نئی تجاویز اختیار کی جائیں اُن میں اُردو کے حقوق کو نظر انداز نہ کیا جائے ۔

(۵) ناگ پور یونی ورسٹی سے درخواست کی جائے کہ وہ اُردو کے امتحانات کا نصاب معین کر کے شائع کرے ۔

اِس گفتگو کی یادداشت میں نے لکھ کر بھی وزیر تعلیم کی خدمت میں بھیج دی تھی ۔ کہ وہ اس کی توثیق فرمادیں ۔

اُنھوں نے اپنی مہربانی سے جو جواب عنایت فرمایا ہو اس کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہو ۔

"جناب من ۔

آپ کا خط (بلا تاریخ) پہنچا اور اس کے ساتھ وہ امور یادداشت بھی وصول

ہوئے جو آپ نے ۳ر ستمبر کو ناگ پور میں بوقت ملاقات پیش کیے تھے عنقریب کونسل ایک مستقل مجلس تعلیم مقرر کرنے والی ہی اس وقت آپ کی یادداشت اس کے سامنے پیش کر دی جائے گی۔ اس کی رپوٹ پر تعلیم کی اس پالیسی کے ساتھ غور کیا جائے گا جو اس صوبے کے لیے آیندہ دو مہینے کے عرصے میں مقرر کی جائے گی۔ اس وقت میں آپ کو آپ کے مطالبات کے متعلق حکومت کے فیصلے سے باقاعدہ اور سرکاری طور پر مطلع کر سکوں گا۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہی کہ کانگریس کی یہ پالیسی ہی کہ وہ تمام اقلیتوں کی زبان اور تہذیب (کلچر) کی حفاظت کرے۔ آپ کے مطالبات کا مناسب لحاظ کیا جائے گا۔ اس وقت اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

مذکورہ بالا مراسلت میں جس گفتگو کا حوالہ دیا گیا ہی اس سے کچھ دنوں بعد ہی ودیا مندر اسکیم شایع ہو گئی۔ شکلا جی نے ازراہِ عنایت اسکیم کی ایک کاپی ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کے پاس بھی ارسال فرمانے کی زحمت گوارا کی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس پر ایک مفصل نوٹ تحریر فرمایا جو یہاں درج کیا جارہا ہی۔

ودیا مندر اسکیم

ودیا مندر اسکیم کا معاملہ ابھی تک طے نہیں پایا۔ مسٹر شکلا وزیر تعلیم نے مجھے ودیا مندر اسکیم کی ایک نقل بھیجی تھی اور خواہش کی تھی کہ میں اپنی رائے اس کے متعلق ظاہر کروں۔ اس کے جواب میں میں نے جو خط انھیں لکھا تھا اس کا ترجمہ یہ ہی:-

ڈیر مسٹر شکلا!

میں آپ کے عنایت نامے مورخہ ۲ر مارچ ۱۹۳۸ء اور ودیا مندر اسکیم کی

مرسلہ نقل کا بہت شکرگزار ہوں۔

میں نے اس اسکیم کو بہ غور پڑھا خصوصاً اس نظر سے کہ آپ کے صوبے کے اُردو بولنے والے طبقے پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔

اِس اسکیم میں دو امور آپ کے غور کے قابل ہیں۔

(۱) مجوزہ مدارس کا نام یعنی "ودیا مندر" لفظی اعتبار سے کیسا ہی اچھا ہو لیکن اس ملک میں ایک قومی ادارے کے لیے ہرگز موزوں نہیں ہو سکتا۔ اس سے مذہبی اندیشے پیدا ہوں گے۔ خود آپ کی اسکیم کے یہ الفاظ کہ "اس نام میں کئی کششیں ہیں" ان اندیشوں کو ابھار رہے ہیں۔ یہ الفاظ پڑھ کر یہ پوچھنے کو جی چاہتا ہی کہ علاوہ خالص تعلیمی کشش کے دوسری کششیں کون سی ہیں؟ صرف یہی نہیں بلکہ (جیسا کہ اسکیم میں درج ہی) آپ کی اسکیم ۹۹ فی صدی اشخاص میں مقبول ہونے کی توقع رکھتی ہی۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ یہ اسکیم آپ کے صوبے کی اکثریت کے لیے ایک فرقہ واری کشش رکھتی ہی۔ اس بنا پر میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ اس نام کو بدل کر کوئی مناسب نام تجویز کیجیے۔ نیز ایک طبقے کے مدارس کے لیے ودیا مندر اور دوسرے طبقے کے مدارس کے لیے "بیت العلوم" کے نام کی تجویز کرنے سے بھی یہ مشکل حل نہیں ہوتی۔ اس سے خواہ مخواہ مذہبی تفریق کا خیال پیدا ہوگا۔

سب سے آسان بات تو یہ تھی کہ ہندستانی زبان میں جو الفاظ مروج ہیں انھیں میں سے کوئی اختیار کر لیا جاتا۔ مثلاً مکتب۔ مدرسہ۔ اسکول۔ لیکن اگر آپ کو کسی نئے لفظ ہی کے ایجاد کا شوق ہی تو اس کے لیے قدیم لفظوں اور ترکیبوں کی تلاش یا ایسے الفاظ کے استعمال کی کیا ضرورت ہی جن کی تہ میں مذہبی خیال ہو۔ اور جو کسی خاص فرقے کے لیے کشش رکھتا ہو۔ میں آپ کی

خدمت میں "پڑھائی گھر" کا نام پیش کرتا ہوں جو اپنی ساخت اور ترکیب کے لحاظ سے بالکل ہندستانی ہی۔

(۲) اس اسکیم کی رُو سے جہاں کہیں چالیس لڑکے لڑکیاں پڑھنے کی قابل عمر کی ہوں گی وہاں ایک مدرسہ قائم کر دیا جائے گا۔ اس شرط کے ہوتے ہوئے ایسے مقام پر کیا انتظام ہوگا جہاں دس اُردو کے طالب علم ہیں اور تیس مرہٹی کے؟ اسکیم میں یہ بھی تجویز کیا گیا ہی کہ تعلیم مادری زبان کے ذریعے سے ہوگی۔ ایسی حالت میں ان دس اُردو بولنے والے طالب علموں کا کیا حشر ہوگا؟ اگر آپ انھیں مرہٹی کے ذریعے سے تعلیم حاصل کرنے پر مجبور کریں گے تو یہ آپ کی اسکیم کے مقصد کے خلاف ہوگا۔ اس مشکل کے رفع کرنے کے لیے کیا آپ ان دس اُردو کے طالب علموں کے لیے الگ مدرسہ قائم کریں گے؟ آپ یہ نہیں کر سکتے تو لازمی اور جبری تعلیم کی صورت میں جو والدین کو سزا دی جائے گی اُسے اٹھا دینا پڑے گا اور اگر آپ یہ کرتے ہیں تو اس سے آپ کی اسکیم کی غایت فوت ہو جاتی ہی۔

ان تمام حالات پر غور کرنے کے بعد میں محسوس کرنے پر مجبور ہوں کہ آپ کی اسکیم زیادہ تر بلکہ تمام تر آپ کے صوبے کے ایک ہی فرقے کے لیے کارآمد ہو سکتی ہی اور دوسرے فرقے کے لیے کسی طرح مفید نہیں ہو سکتی۔ میری رائے میں یہ مناسب ہوگا کہ آپ اس کے بجائے واردھا اسکیم کو وہ جیسی کچھ بھی ہی، اختیار کر لیں اور اپنے صوبے میں اس کا تجربہ کر کے دیکھیں۔

آخر میں آپ کی نئی اسکیم کے متعلق ضلع بیتول کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ آپ اس ضلع میں ۱۲۶ مدرسے کھولنا چاہتے ہیں۔ جنھیں گورنمنٹ سے امداد دی جائے گی۔ مجھے امید ہی کہ یہ مدرسے بھی واردھا اسکیم کے تحت کام کریں گے۔"

میں ۱۷ مارچ کو ایک دن کے لیے ناگ پور گیا اور بعض اصحاب سے اس اسکیم کے متعلق مشورہ کیا ۔ اسی شب کو ایک عام جلسہ عبدالسلام فاروقی جناب ایڈووکیٹ ہائی کورٹ کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں میں نے ہندستان کی مشترکہ زبان اُردو یعنی ہندستانی پر تقریر کی ۔ تقریروں کے بعد یہ قرارداد بالاتفاق منظور ہوئی کہ ایک وفد اُس مجلس نصاب تعلیم کی خدمت میں حاضر ہو جو گورمنٹ نے وردیا مندر اسکیم کے ضمن میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی صدارت میں قائم کی ہے اور مجلس کے سامنے اس صوبے کے مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات اور اُردو مدرسوں کے قیام کے مناسب انتظام کے متعلق اپنی تجاویز پیش کرے ۔ انجمن ترقیٔ اُردو ناگ پور نے بھی اپنے جلسے میں اس اسکیم کے خلاف قرارداد منظور کی اور اس کی نقلیں گورمنٹ سی ۔ پی کو اور مہاتما گاندھی اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو بھیجیں گئیں ۔

اس معاملے میں علاوہ انجمن ترقیٔ اُردو ناگ پور کے خان بہادر مرزا رحمٰن بیگ صاحب اور خان بہادر عبدالرحمٰن صاحب ایم ۔ ایل ۔ اے نے خاص طور پر کوشش کی ، اسمبلی میں بھی اور اسمبلی کے باہر بھی ۔ ہم جناب خان بہادر صاحب کے بہت ممنون ہیں کہ انھوں نے اردو کی حمایت میں عین وقت پر کام کیا ۔ انھوں نے گاندھی جی کو اس بارے میں ایک مفصل خط لکھا ہے ۔ اگر اس پر توجہ کی جاتی تو یہ مسئلہ بہت آسانی سے حل ہو جاتا ۔ مرزا صاحب نے اس خط میں بڑی تفصیل سے اس اسکیم پر بحث کی ہے اور اس کے نقائص و نتائج پر بڑی روشنی ڈالی ہے ۔ آخر میں انھوں نے مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم کو مدنظر رکھ کر چند تجویزیں پیش کی ہیں اور گاندھی جی سے درخواست کی ہے کہ وہ ان پر غور فرمائیں اور صوبے کی گورمنٹ کو مشورہ دیں کہ اس معاملے میں مناسب کارروائی کرے ۔

وہ تجاویز یہ ہیں:-

(۱) ودیا مندر کے نام کا فیصلہ بہار کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے جس میں بابو راجندر پرشاد اور مولوی عبدالحق اور دیگر اصحاب شریک ہیں تاکہ وہ اس کے بدلے کوئی ایسا نام تجویز کریں جو تمام فرقوں کے لیے قابل قبول ہو۔

(۲) مسلمانوں کی لازمی و ابتدائی تعلیم کا مسئلہ ور دھا اسکیم کے تحت حل کیا جاسکتا ہے۔

(۳) موجودہ اُردو پرائمری اور مڈل اسکول علیٰ حالہ قائم رہنے چاہئیں۔ نہ تو وہ بند کیے جائیں اور نہ کبھی وہ ہندی یا مرہٹی اسکولوں میں ضم کیے جائیں۔

(۴) جہاں کافی تعداد پڑھنے والوں کی مل سکے وہاں گورمنٹ کے خرچ سے اُردو مدرسہ قائم کر دیا جائے۔

(۵) جہاں کہیں تعداد کافی نہ ہو اور علاحدہ اُردو کا مدرسہ نہ کھولا جاسکے وہاں اُن لڑکوں کو اُن کی مادری زبان یعنی اُردو میں تعلیم دینے کا انتظام کیا جائے۔

(۶) چوں کہ تعلیم کا تعلق ہر قوم کی زبان اور تہذیب سے ہے لہذا ہر کمیٹی میں جو اس غرض سے قائم کی جائے، مسلمانوں کی مناسب نیابت کا خیال رکھا جائے۔ مسلمانوں کو اپنی زبان کے مستقبل کے متعلق بہت بڑا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔ ان کو نصاب کی کمیٹی، ہائی ایجوکیشن بورڈ، ٹکسٹ بک کمیٹی، نیز یونی ورسٹی کی کمیٹیوں میں شریک ہونے کا پورا موقع دیا جائے۔

(۷) اُردو اسکولوں کے نام کا مسئلہ نیز یہ مسئلہ کہ علاحدہ اُردو مدرسہ کھولنے کے لیے کس قدر طالب علموں کی شرط لگائی جائے۔ مسلم تعلیمی اداروں اور مسلم ماہرانِ تعلیم کے مشورے سے طے کیا جائے (یہاں انھوں نے اُردو وغیرہ کے

نام بھی لکھ دیے ہیں) اور زبان کے معاملے میں انجمنِ ترقی اُردو ہند کا فیصلہ ناطق سمجھا جائے۔

ان میں اکثر تجویزیں بہت معقول اور ضروری ہیں لیکن ان پر کوئی توجہ نہیں کی گئی اور نہ آیندہ اس کی توقع ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ سی۔ پی کی حکومت نے اس سال دو لاکھ رُپیہ ودیا مندر اسکیم کے لیے منظور کیا ہے۔ اُردو کی قسمت میں اس میں سے ایک حبہ بھی نہیں۔ بیتول کے ضلع میں ہندی لازمی کی جارہی ہے۔ صرف ایک اُردو اسکول تھا وہ بھی بند کردیا گیا۔ چناں چہ ناگ پور کا روزانہ انگریزی اخبار 'ہتواد' ۲۵ فروری ۱۹۳۸ء کی اشاعت میں لکھتا ہے:۔

"ڈسٹرکٹ کونسل بیتول نے اپنے ضلع میں جبری تعلیم جاری کرنے کے لیے ایک اسکیم پیش کی ہے جس کی رو سے ۳۹ دیہاتی مرکز قائم کیے گئے ہیں جن میں ۹۶ گانو ایسے ہیں جن میں کوئی مدرسے نہیں۔ تجویز یہ ہے کہ جبر بتدریج عمل میں لایا جائے۔ یعنی پہلے سال ۶ سے ۸ سال تک کی عمر والوں کے لیے؛ دوسرے ۶ سے ۹ سال اور تیسرے سال ۶ سے ۱۰ اور ۶ سے ۱۱ تک کی عمر کے بچیوں کے لیے ہمیشہ کے واسطے۔ اس اسکیم سے صرف یورپین اور اینگلو انڈین مستثنےٰ کیے گئے ہیں۔ باقی سب پر اس کا نفاذ ہوگا۔ ذریعہ تعلیم ہندی زبان ہوگی اور دس سال کے عمر تک کے لڑکے لڑکیاں مل کر پڑھیں گے۔ اس قسم کی بیتول ضلع کے لیے دو اور اسکیمیں پیش کی گئی ہیں اور رقمیں بھی منظور ہوگئی ہیں"۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ بیتول ضلع میں اُردو کے پڑھانے کا کوئی انتظام نہ ہوگا۔ ڈسٹرکٹ کونسل اور حکومت نے یہ فرض کرلیا ہے کہ ضلع بھر میں کسی کی زبان اُردو نہیں۔ اور نہ اس کی تعلیم کی کوئی ضرورت ہے۔

اسی خیال سے میں نے تین مستعد نوجوان طالب علموں کو سی۔ پی اور برار کے دورے پر بھیجا ہی کہ وہ اس صوبے کے اضلاع اور قصبات کا دورہ کرکے تمام ضروری معلومات بہم پہنچائیں اور یہ دیکھیں کہ اردو کے تعلیم واشاعت کے کیا امکانات ہیں۔ اور اس کے لیے کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔ اس کے متعلق آیندہ تفصیل سے لکھوں گا۔

نصاب تعلیم کی کمیٹی کی رپوٹ کا بھی انتظار ہی۔ یہ دیکھنا ہی کہ اس نے کیا تجاویز پیش کی ہیں۔ افسوس ہی کہ ان تمام کمیٹیوں میں صوبے کے کسی مسلمان کو شریک نہیں کیا گیا۔ حالاں کہ اس کی بہت ضرورت تھی۔ اس سے کمیٹی کے کام میں آسانی پیدا ہوتی اور اسے علم ہوجاتا کہ وہاں کے مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات اور مطالبات کیا ہیں۔

وردو میونسپل کمیٹی نے اُردو اسکول کا نام بدل کر 'اُردو ودیا مندر' رکھ دیا ہی۔ مسٹر ہدایت علی ایم۔ ایل۔ اے نے اس کے متعلق اسمبلی میں سوال کیا تو مسٹر شکلا وزیر تعلیم نے اس کا اعتراف کیا کہ بے شک نام بدل دیا گیا ہی۔ اور جب انھوں نے یہ پوچھا کہ کیا گورمنٹ نے اس کے متعلق کوئی احکام جاری کیے تھے تو جواب دیا گیا کہ نہیں۔ اس کے بعد کے سوال وجواب یہ ہیں:-

سوال: کیا یہ واقعہ ہی کہ وردو کے مسلمانوں کو اس نام کی تبدیلی پر سخت اعتراض ہی۔

جواب: ڈپٹی انسپکٹر اُردو مدارس کا بیان ہی کہ مسلمانوں کو عام طور پر میونسپل کمیٹی کے اس عمل کے خلاف اعتراض ہی لیکن وردو کے کسی مسلمان کی طرف سے میونسپل کمیٹی میں کوئی شکایت یا اعتراض پیش نہیں ہوا۔

سوال: کیا گورمنٹ کو احتجاجی رزولیوشن وصول ہوتے ہیں؟ کیا

امراؤتی ڈسٹرکٹ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے کوئی احتجاج اس بارے میں کیا گیا ہی؟

جواب: امراوتی ڈسٹرکٹ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی سنٹرل سٹینڈنگ کمیٹی کی طرف سے اس کی مخالفت میں ایک رزولیوشن وصول ہوا ہی

سوال: کیا گورنمنٹ مہربانی کرکے اُردو اسکول ورود کے سابق نام کے برقرار رکھنے میں کوئی کارروائی کرے گی۔

جواب: ڈپٹی کمشنر نے میونسپل کمیٹی کو اس معاملے کی طرف توجہ دلائی تھی۔ کمیٹی کا جواب رزولیوشن مورخہ ۲۵ر جنوری ۱۹۳۸ء میں موجود ہی۔ کمیٹی میں ڈپٹی کمشنر کا خط پیش کیا گیا۔ اس پر جو بحث ہوئی اس میں یہ بیان کیا گیا کہ بے شک نام بدل دیا گیا ہی اور اس سے کسی فرقے یا مذہب کے جذبات کو صدمہ پہنچانا مقصود نہیں ہی اور محض نام کے بدلنے سے مسلمانوں کی تہذیب پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا اور نہ اس سے اکثریت کی تہذیب کا اچھا اور تفوق قائم کرنا مقصود ہی۔

اس تمام کارروائی سے ظاہر ہی کہ ہوا کا کیا رُخ ہی۔

اگرچہ یہ نوٹ بڑی نیک نیتی اور صفائی سے لکھا گیا تھا۔ لیکن افسوس کہ شکلاجی اور صوبۂ متوسط و برار کی کانگریسی وزارت پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ صوبۂ متوسط و برار کے اُردو بولنے والوں نے خواہ وہ کسی سیاسی عقیدے کے ماننے والے ہوں۔ اسکیم کے خلاف متحدہ محاذ قائم کیا۔ جلسے، جلوس، قراردادیں اور وفود سب کا سہارا لیا گیا۔ لیکن شکلاجی کی ہٹ کے سامنے ایک نہ چلی۔ ودیا مندر اسکیم کے سلسلے میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے وقتاً فوقتاً جو تحریریں اور نوٹ لکھے اور جو اوپر درج کردیے گئے ہیں اُن سے صاف ظاہر ہوتا ہی کہ ودیا مندر اسکیم کے سلسلے میں ڈاکٹر مولوی

عبدالحق صاحب کا اختلاف محض اختلاف کے لیے نہ تھا وہ اس کے سوا اور کچھ نہ چاہتے تھے کہ ودیا مندر اسکیم میں اس قسم کی ترمیم کردی جلائے کہ اس سے اُردو والوں کے مفاد کو بھی نقصان نہ پہنچے۔ اسی سلسلے میں یہاں ڈاکٹر صاحب ممدوح کے دو اور نوٹ بھی درج کیے جارہے ہیں جس سے ایک طرف مذکورہ بالا دعوے کی تصدیق ہوتی ہے اور دوسری جانب کانگریسی وزارت کی "راج ہٹ" کا پردہ چاک ہوتا ہے

سی۔پی اور ہندی اُردو

سی۔پی (ممالک متوسط) کی حکومت کے وزیر تعلیم مسٹر شکلا کی ابتدائی تعلیم کی اسکیم شایع ہوگئی۔ اس کا خلاصہ یہ ہے:-

۱۔ اس کا نام "ودیا مندر" تجویز کیا گیا

۲۔ یہ تعلیم مفت اور جبری ہوگی۔

۳۔ اس کا نفاذ ان تمام دیہات میں ہوگا جہاں قابلِ تعلیم عمر کے چالیس لڑکے لڑکیاں ہوں گے۔

۴۔ ذریعۂ تعلیم مادری زبان ہوگا۔

۵۔ ان مدارس میں صرف ایک مدرس رکھا جائے گا۔

مسلمانوں کو اس نام پر اعتراض ہے۔ یہ مسٹر شکلا کی جدت ہے اور اس پر "ایجادِ بندہ" کی مثل صادق آتی ہے۔ پہلے سے جو نام چلے آرہے ہیں ان کو بدلنے کی بظاہر کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ مجھ سے بھی مسٹر شکلا سے اس بارے میں گفتگو آئی تھی، ان کا خیال ہے کہ اس نام میں "تقدس" کی شان پیدا ہوجاتی ہے۔ بات یہ ہے کہ باوجود صدہا سال ایک ساتھ رہنے کے ہم ایک دوسرے کے جذبات اور خیالات سے ناواقف ہیں۔ ہم اپنی بات چیت، تقریر اور کردار کے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ ہمارے سوا دوسرے لوگ بھی اس ملک میں آباد ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک ذرا سی

لغزش اور ایک معمولی سے لفظ سے بدگمانی پیدا ہوجاتی ہی اور اس کا اصل کام پر برُا اثر پڑتا ہی۔ مسٹر شکلا کی نیک نیتی سہی لیکن مصلحت وقت کے خلاف ہی۔

قطع نظر اس کے اس تجویز کی رُو سے وہ بچے جن کی مادری زبان اُردو ہی یا جو اُردو کے ذریعے سے تعلیم پانا چاہتے ہیں، اُردو زبان سیکھنے سے محروم رہ جائیں گے۔ اس کے چند وجوہ یہ ہیں:۔

اول: سی۔پی میں ایسے دیہات شاذو نادر ہی ملیں گے جن میں چالیس قابلِ تعلیم بچے ایسے ہوں جن کی مادری زبان اُردو ہو۔ اگرچہ ہندی ودیا مندر اور مرہٹی ودیا مندر کے ساتھ اُردو ودیا مندر کا نام بھی تجویز کیا گیا ہو لیکن یہ نام ہی نام رہے گا۔ نہ چالیس اردو والے بچے ملیں گے نہ اُردو ودیا مندر آباد ہوگا۔

دوسرے ایسے مدرسوں میں صرف ایک ایک مدرس ہوگا اور ظاہر ہی کہ یہ مدرس یا تو ہندی داں ہوگا یا مرہٹی داں۔ اُردو داں شاید ہی کوئی نکلے۔

نتیجہ یہ ہوگا کہ اُردو پڑھنے والوں کے لیے اُردو سیکھنے کی کوئی صورت نہ ہوگی۔ اور چوں کہ تعلیم جبری ہوگی اس لیے ان کو لامحالہ ہندی یا مرہٹی پڑھنی ہوگی۔ چند سال بعد اعداد اور شمار کے ذریعے یہ ثابت کرنا کچھ مشکل نہ ہوگا کہ اس صوبے کی زبان ہندی یا مرہٹی ہی اُردو نہیں لہٰذا اُردو ودیا مندر تعلیم سے خارج۔ اس کے بعد دوسرا اندیشہ یہ ہی کہ اس وقت جو اُردو مدرسے جاری ہیں وہ بھی نہ بند کردیے جائیں

میری یہ بدگمانی بلاوجہ نہیں ہی اور خدا کرے یہ غلط ثابت ہو لیکن جو تجویز پیش کی گئی ہی اس کے لیے نتیجے ایسے صاف اور صریح ہیں کہ کوئی معقول پسند شخص اس سے انکار نہیں کرسکتا۔ اس لیے مسٹر شکلا کی یہ اسکیم ہمارے لیے نہایت اندیشہ ناک ہی۔

اس سے سی۔پی کے مسلمانوں میں بہت جوش پھیلا ہوا ہی۔ انجمن کی ایک

شاخ ناگ پور میں ہی جو بہت اچھا کام کر رہی ہی۔ اس کے ارکان نے ایک جلسہ
کر کے اس کے خلاف ایک قرار داد منظور کی۔

اس کے بعد شہر کے مسلمانوں کا ایک عام جلسہ ہوا جس میں تقریباً پانچ ہزار
اشخاص شریک تھے اور اس کے صدر انجمن ترقی اُردو کے رکن محمد ابراہیم خاں صاحب
میونسپل کمشنر تھے۔ اس جلسے کا یہ اثر ہوا کہ آنریبل یوسف شریف صاحب وزیر قانون
والنصاف نے ہماری انجمن کے پرجوش اور قابل رکن مولوی حکیم اسرار احمد صاحب
کو بلا بھیجا اور کہا کہ حکومت اس اسکیم پر نظر ثانی کرنے کے لیے تیار ہی۔ اسی سلسلے میں
انھوں نے گاندھی جی سے ملاقات کا وقت مقرر کیا۔ چناں چہ حکیم صاحب وزیر صاحب
کے ساتھ شوگانو پہنچے اور گاندھی جی سے اس معاملے میں صاف صاف گفتگو ہوئی۔
گاندھی جی نے فرمایا کہ "مندر" کا لفظ نکال دیا جائے گا یعنی وہ وزیر تعلیم کو زبانی سمجھا
دیں گے وہ اس لفظ کے بجائے کوئی دوسرا لفظ رکھ دیں۔ اور "ودیا مندر" والی اسکیم کو
وردھا اسکیم کے تابع کر دیا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہی کہ ہندستانی بولنے والے
علاقے میں دونوں خطوں کی تعلیم لازمی ہوگی اور غیر بولنے والے علاقے میں تعلیم کے
پانچویں اور چھٹویں سال میں ہندستانی زبان کی تعلیم کسی ایک رسم خط میں ضرور ہوگی۔
(اس صوبے میں گیارہ اضلاع ہندستانی بولنے والے اور سات مرہٹی بولنے والے ہیں)
اگرچہ اس سے بھی ہمارا منشا پورا نہ ہوتا تاہم موجودہ ناگوار حالت میں یہ بھی غنیمت
معلوم ہوتا ہی۔ بشرطیکہ یہ ہو جائے۔

کچھ عرصہ ہوا میں نے مسٹر شکلا سے مل کر اُردو تعلیم کے متعلق اپنے مطالبات
پیش کیے تھے اور بعد میں انھیں لکھ کر بغرض تصدیق مسٹر شکلا کی خدمت میں بھیجا تھا
تو انھوں نے اپنے جواب میں مجھے یہ لکھا تھا کہ میری یادداشت کو اپنی تعلیمی اسٹینڈنگ
کمیٹی میں جو قائم ہونے والی ہی پیش کر دیں گے۔ خط کے آخر میں انھوں نے یہ بھی

تحریر فرمایا تھا کہ کانگریس کے اصول کی رو سے اقلیتوں کی تہذیب اور زبان کی حفاظت ان کا فرض

سیاسی عقیدے اور وعدے دیکھنے اور سننے میں بہت معقول اور بہت دل خوش کن ہوتے ہیں۔ لیکن عمل کچھ اس ڈھنگ سے کیا جاتا ہے کہ فریق ثانی کے کچھ پلے نہ پڑے اور ساتھ ہی قانونی اور منطقی گرفت بھی نہ ہو سکے۔ معلوم یہ ہوا کہ مسلسل شور و غل، مخالفت لڑائی جھگڑے سے کچھ مل جائے تو مل جائے ورنہ ان معاملات میں انصاف کی توقع رکھنا نری سادہ لوحی ہے۔

صوبۂ متوسط سی۔پی

صوبۂ متوسط کی حالت سب سے نرالی ہے۔ ودیا مندر اسکیم نے مسلمانوں میں عجیب و غریب جوش پیدا کر دیا۔ ۱۵ ستمبر کو بیس ہزار مسلمانوں کا مجمع جس شان سے مجلس قانون ساز (لیجس لیٹو اسمبلی) پر اپنی فریاد لے کر پہنچا ہے وہ سی۔پی کی تاریخ میں یادگار چیز ہوگی۔ اس میں بوڑھے، جوان، بچے، امیر و غریب سب ہی تھے اور دور دور سے آکر شریک ہوئے تھے۔ ہاتھوں میں ہزاروں کالے جھنڈے لہرا رہے تھے اور سینوں پر "اردو زندہ باد" کے تمغے لگے ہوئے تھے۔ جوش کی انتہا یہ تھی کہ عورتوں نے اپنے جلسے کر کے ودیا مندر اسکیم کے خلاف قراردادیں منظور کیں اور مردوں کو کہلا بھیجا کہ اگر تم کچھ نہیں کر سکتے ہو تو تمھارے لیے چوڑیاں اور ساڑیاں حاضر ہیں۔ یہ مجمع جھلستی دھوپ میں کامل امن و امان کے ساتھ بارگاہ وزارت پر حاضر ہوا۔ آنریبل مسٹر شکلا وزیر اعظم نے جو جواب دیا وہ ناکافی ہی نہ تھا بلکہ بہت مایوس کن تھا۔ ان کا سب سے پہلا جملہ یہ تھا کہ "مسلمانوں کو اس معاملے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔" "غلط فہمی" کا لفظ بھی عجیب و غریب ہے۔ یہ ایک انگریزی

لفظ کا ترجمہ ہی جو انگریزی تعلیم کی بدولت ہم تک پہنچا ہی۔ انگریزی زبان سیاست کاری میں اپنا جواب نہیں رکھتی اور اس لفظ میں سیاست کاری کے سارے انداز موجود ہیں۔ وہ اپنی ایک ادا سے ایک قوم کی زبان و تہذیب کو مٹانا چاہتے ہیں اور جب وہ بے بسی کے عالم میں فریاد کرتی ہی تو نہایت اطمینان سے یہ جواب دیا جاتا ہی کہ "آپ کو غلط فہمی ہوئی ہی"۔

ودیا مندر اسکیم کے متعلق اس قدر کہا اور لکھا جا چکا ہی کہ اس پر کسی زیادہ بحث کی ضرورت نہیں رہی۔ یہ اب سارے ہندستان کا مسئلہ ہو گیا ہی۔ چناں چہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور مسلم لیگ نے بھی اس کے خلاف قرار دادیں منظور کی ہیں۔ میں نے اس کے متعلق ایک کھلی چٹھی مہاتما گاندھی کے نام لکھی تھی۔ اس کا انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے اپنی عنایت سے گاندھی جی کو ایک بہت ہی معقول خط لکھا اور اس مسئلے کی طرف متوجہ کیا اور لکھا کہ اس نام کی وجہ سے بہت شورش پھیلی ہوئی ہی۔ اور ہندو مسلمانوں کے تعلقات بہت خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ اس مشکل کو آپ ہی حل کر سکتے ہیں۔ گاندھی جی نے حسبِ معمول ایک مختصر سا جواب دے کر ٹال دیا۔ جواب یہ تھا "میرے پاس مولوی صاحب کا خط نہیں ہی۔ میں ابھی شکلا جی کو لکھ رہا ہوں۔ آپ ضرورت سے زیادہ مجھ پر بھروسہ کر رہے ہیں۔ میں معقول سمجھوتے کے لیے جان دینے کے لیے تیار ہوں۔ میرے دل کو اطمینان ہوگا اگر میرے مرنے کے بعد لوگ مجھے اس بات سے یاد کریں کہ میں نے دونوں قوموں کی صلح و آشتی میں مقدور بھر کوشش کی"۔

معلوم نہیں گاندھی جی نے کیا لکھا اور شکلا جی نے کیا جواب دیا۔ اس سے قبل ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے بھی اس بارے میں مسٹر شکلا کو لکھا تھا مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

۲۳ و ۲۴ ر اکتوبر کو ناگ پور میں صوبے کی اُردو کانفرنس تھی ۔ تخمیناً دس ہزار کا مجمع تھا اور لوگوں کے جوش کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ ان کو اپنی زبان سے کس قدر محبت ہو۔ اِس کانفرنس میں بھی ودیا مندر کا ذکرِ خیر بہت کچھ رہا اور ایک قرارداد بھی اس کے خلاف منظور کی گئی ۔ یہ جوش اب اس حد تک پہنچ گیا ہو کہ حال میں سی۔پی کی مسلم لیگ کی تنظیمی کمیٹی نے سول نافرمانی کا تہیہ کرلیا ہو اور وہاں کے ممتاز اصحاب نے اس میں شرکت کے لیے ایک عہد نامے پر دستخط کیے ہیں ۔

کانفرنس کے ایام میں سی۔پی کے وزرا نے مجھ سے ملاقت کی خواہش کی۔ میں اُن سے ملا۔ وہی ودیا مندر کا ذکرِ خیر۔ آنریبل مسٹر شکلا اور مسٹر مصرا اس بات پر آمادہ ہیں کہ ودیا مندر اسکولوں کے لیے جو چالیس پڑھنے والوں کی شرط ہو۔ مسلمانوں کے لیے کم کرکے بیس کر دیے جائیں ۔موجودہ اُردو مدرسوں کو بحال رکھا جائے گا جو بند کر دیے گئے ہیں وہ جاری کر دیے جائیں گے۔لیکن نام نہیں بدلنا چاہیے ۔وہ کہتے کہ آپ نام کے پیچھے کیوں پڑ رہے ہیں۔میں نے کہا کہ نام کے پیچھے تو آپ پڑ رہے ہیں ۔نام آپ کی ایجاد ہو اور آپ ہی اس پر اصرار کر رہے ہیں۔ مسٹر شکلا کو کچھ ضد سی آپڑی ہو وہ اس مقدس نام میں سی قسم کی تبدیلی کے روادار نہیں ۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ ہمیں فرقہ پرست کہتے ہیں اور فرقہ پرستی کا الزام دیتے ہیں لیکن یہ نام کس کی چغلی کھا رہا ہو جس میں سراسر فرقہ پرستی کی بباند آتی ہو۔سب کچھ کہا مگر وہ نام بدلنے پر رضامند نہ ہوئے ۔

سنا ہو کہ اس قضیے کے فیصلے کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد تشریف لانے والے ہیں۔ان کا منشا ہو کہ اُن کے آنے تک سول نافرمانی ملتوی رکھی جائے دیکھیے ان کی گفت و شنید کا کیا نتیجہ نکلتا ہو ۔

ودیا مندر نے تو پہلے ہی آگ لگا رکھی تھی ۔لیکن مسلمانوں کے ایک

ترمیم کے جواب میں آنریبل مسٹر مہتا ممبر فنانس کی تقریر نے اس جلتی ہوئی آگ پر تیل کا کام کیا۔ مسلمان ممبران اسمبلی کی ترمیم یہ تھی کہ اسمبلی کے قواعد میں ہندی اور مرہٹی کو صوبے کی رائج زبانوں میں شمار کیا گیا ہو۔ اس قاعدے میں بجائے ہندی کے ہندستانی کا لفظ استعمال کیا جائے۔ اس پر مسٹر مہتا بہت برافروختہ ہوئے۔ انھوں نے اس مطالبے کو نامعقول اور ناقابلِ عمل ٹھیرایا اور فرمایا کہ جو لوگ کانفرنس کو قومی جماعت تسلیم نہیں کرتے انھیں کانگریس کی کراچی والی تجویز پر ہماری توجہ مبذول کرانے کا کوئی حق نہیں ہو۔ انھیں کیا حق ہو کہ اس تجویز کا حوالہ دے کر ہم پر نکتہ چینی کریں۔ کسی اقلیت کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ ایوان کی اکثریت سے نامعقول مطالبے منوانے کی کوشش کریں۔ انھوں نے سی۔پی کے مسلمانوں کو اقلیت سے تعبیر کیا۔ یعنی ایسی حقیر اقلیت جو بغیر خوردبین کے نظر نہیں آسکتی۔ یہ حکومت کے وزیر کی تقریر ہو یا مجذوب کی بڑ۔ حکومت کے نشے نے دماغ خراب کر دیا۔ مسٹر مہتا کو یاد رکھنا چاہیے کہ اقلیت اور اکثریت کوئی چیز نہیں۔ جماعت کی ہمت اور عزم ایک ادنا اقلیت کو اعلا اکثریت میں بدل دیتا ہو۔ انھیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ کون اقلیت میں ہو اور کون اکثریت میں ہو۔ جب بیس ہزار مسلمان اسمبلی پر پہنچے تھے تو مسٹر مہتا نے انھیں خوردبین سے ملاحظہ فرمایا تھا یا خالی آنکھ سے۔ یہ ہو کانگریس کی قرارداد کی وقعت۔

آخر کار جب ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی اپیلیں اور صوبۂ متوسط و برار کے حامیان و محبانِ اُردو کی چیخ پکار بارگاہِ وزارت سے ٹھکرا دی گئی تو ڈاکٹر صاحب ممدوح نے گاندھی جی کی خدمت میں "ودیامندر اسکیم" کے متعلق ایک کھلی چھٹی بھیجی جو تاریخی حیثیت حاصل کر چکی ہو۔ یہ چھٹی ملک بھر کے موقر اُردو اور انگریزی اخبارات

یں چھپی اور اس کی ایک اُردو اور انگریزی کاپی براہِ راست ڈاک کے ذریعے گاندھی جی کی خدمت میں بھیجی گئی لیکن اس سرکار سے بھی کوئی شافی یا غیر شافی جواب نہ مرحمت ہوا۔ یہ کھلی چٹھی "ودیا مندر اسکیم" کے سلسلے میں "حرفِ آخر" کی قیمت رکھتی ہے لہٰذا! اسے یہاں بجنسہٖ پیش کیا جاتا ہے۔

ودیا مندر اسکیم

ڈیر گاندھی جی!

میں آپ سے تھوڑی دیر کے لیے دو چار صاف صاف اور سیدھی باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ آپ چوں کہ دوسروں کی سنتے ہیں اور ہر مشکل کو آسان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے مجھے امید ہے کہ آپ ہماری مشکل کو بھی آسان کرنے کی کوشش فرمائیں گے۔

آپ ودیا مندر اسکیم سے بہ خوبی واقف ہیں اور آپ کو اس کا علم بھی ضرور ہوگا کہ صوبے کے مسلمان اس اسکیم سے سخت ناراض ہیں۔ اُن کو اس کے نام اور اس کی بعض تفصیلات پر سخت اعتراض ہے۔ اس کی اطلاعیں آپ تک بھی پہنچی ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اس مسئلے کی اہمیت اور اس ناراضگی کی گہرائی کو پوری طرح محسوس نہیں کیا۔ میں آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ ناراضی معمولی نہیں۔ صوبے کے مسلمانوں نے اس کی مخالفت میں کوئی جائز کوشش اٹھا نہیں رکھی اور اب تک یہ جد و جہد جاری ہے۔ چوں کہ انڈین نیشنل کانگریس اور اس کی حکومتیں آپ کی رہ نمائی میں ہیں اور یہ صورت ایسے صوبے میں پیدا ہوئی ہے جسے آپ کے قیام کا شرف حاصل ہے اس لیے یہ توقع بیجا نہیں کہ آپ اس مشکل کے حل کرنے میں مدد دیں گے۔ اس خیال سے میں اس کھلی چٹھی

میں ان تمام کوششوں کی نہایت مختصر روداد عرض کرتا ہوں تاکہ اس مخالفت اور ناراضی کی صحیح کیفیت آپ کے ذہن نشین ہو جائے۔

صوبۂ متوسط اور برار میں جب کانگریس کا اقتدار قائم ہوا۔ تو اس کی پہلی برکت "ودیا مندر اسکیم" کی صورت میں نازل ہوئی۔ ودیا مندر کے نام اور اس کی بعض تفصیلات سے مسلمانوں میں بہت اندیشہ اور اضطراب پیدا ہوا۔ چناں چہ سب سے اوّل انجمن ترقی اُردو، ناگ پور نے اس اسکیم پر غور کرنے کے لیے ۲۴ر جنوری ۱۹۳۸ء کو اپنا ایک خاص اجلاس بمقام مسلم لائبریری ناگ پور میں منعقد کیا۔ بعد کامل غور و بحث کے مجلس نے اس اسکیم کے نام اور اس کی بعض تجویزوں سے شدید اختلاف ظاہر کیا۔ اس قرارداد کی نقل آنریبل وزیر تعلیم اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی خدمت میں بھیجی گئی۔

صرف اسی کاغذی کارروائی پر اکتفا نہیں کی گئی بلکہ اس کے بعد ہی انجمن ترقی اُردو، ناگ پور کے رکن جناب حکیم اسرار احمد صاحب نے سی۔ پی کے سابق وزیر قانون مسٹر یوسف شریف کی معیت میں آپ سے شیوگانو میں ملاقات کی۔ تقریباً ایک گھنٹے کی گفتگو کے بعد آپ نے یہ تسلیم کر لیا کہ واقعی "ودیا مندر اسکیم" کا نام بعض حیثیت سے قابلِ اعتراض ہو۔ اس کے بجائے "ودیالہ" "پاٹ شالہ" زیادہ موزوں اور مناسب ہوگا۔ آپ نے صریح الفاظ میں وعدہ کیا کہ آپ آنریبل مسٹر شکلا وزیر تعلیم صوبۂ متوسط و برار سے گفتگو کر کے کوئی ایسی راہ نکالنے کی کوشش کریں گے کہ یہ اعتراض رفع ہو جائے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہو کہ یا تو آپ کو اپنا وعدہ یاد نہ رہا یا کسی وجہ سے آپ نے مسٹر شکلا سے اس کا تذکرہ مناسب نہ سمجھا ورنہ ممکن نہ تھا کہ ودیا مندر نام باقی رہ جاتا۔

اس ملاقات کے بعد ۱۰ر مارچ ۱۹۳۸ء کو مسلمانوں کا ایک عام جلسہ انجمن

ہائی اسکول ناگ پور کے میدان میں ہوا۔ ان کی دعوت پر میں خاص طور پر ناگ پور پہنچا اور جلسے میں شریک ہوا۔ اس میں بالاتفاق ودیا مندر اسکیم کے خلاف ایک قرارداد منظور کی گئی۔ دوسرے روز انجمن ترقی اردو ناگ پور کی مجلس عاملہ کا جلسہ ہوا جس میں اس قرارداد کی تائید کی گئی۔ نیز یہ طے پایا کہ انجمن کا ایک وفد حکومت کی مقرر کردہ نصاب کمیٹی کے سامنے بھی اپنی شکایات اور مطالبات پیش کرے۔ چناں چہ وفد نے حکیم اسرار احمد صاحب کی قیادت میں ۳۱ مارچ ۱۹۳۹ء کو ناگ پور کے سکریٹریٹ میں ۸ ½ بجے صبح ارکان سے ملاقات کی اور ایک تحریری بیان پیش کیا۔

یہ مخالفت روز بہ روز بڑھتی گئی اور انجمن ترقی اردو ناگ پور کے علاوہ صوبے کی دوسری انجمنوں نے بھی اس اسکیم کے خلاف سخت احتجاج کیا یہاں تک کہ لیجس لیٹو اسمبلی کے مسلمان ممبروں نے بھی اپنے دستخطوں سے اعلان کر دیا کہ وہ ودیا مندر اسکیم سے متفق نہیں۔

اس اسکیم کی مخالفت صرف انھیں لوگوں کی طرف سے نہیں ہوئی جنھیں کانگریسی حلقوں میں فرقہ پرست کہا جاتا ہے بلکہ ان مسلمانوں نے بھی جو قوم پرست یعنی نیشنلسٹ کہے جاتے ہیں۔ اس سے اپنی ناراضی کا اظہار کیا۔ چناں جب مسٹر سوباش چندر بوس ہری پور کے سالانہ اجلاس کانگریس سے واپسی پر ناگ پور تشریف لائے تو مسلم ماس کنٹاکٹ کمیٹی ناگ پور کے ایک وفد نے مسٹر پی۔ کے سالوے ایڈوکیٹ (دیسی) کی قیادت میں مسٹر بوس سے آنریبل مسٹر مصرا کے بنگلہ پر ملاقات کی اور "ودیا مندر" کے متعلق گفتگو کر کے انھیں صوبے کے مسلمانوں کے خیالات اور اختلاف سے پورے طور پر آگاہ کیا۔ مسٹر بوس نے وفد کے مطالبات سے کامل اتفاق ظاہر کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ اسی وقت وردھا جا رہے ہیں جہاں

وہ آپ سے مشورہ کرکے اس معاملے کو سلجھانے کی کوشش کریں گے۔ مسٹر بوس وردھا گئے بھی اور آئے بھی مگر افسوس کہ ودیا مندر اپنی جگہ پر قائم اور اٹل ہے۔

"آپ کو معلوم ہوگا کہ حال میں صوبے کے نیشنلسٹ مسلمانوں کی ایک کانفرنس ہوئی تھی۔ اس میں بھی ودیامندر کے خلاف ایک قرارداد منظور کی گئی۔ اسی طرح ایجوکیشنل کانفرنس برار نے بھی اپنے ایک اہم اجلاس منعقدہ امراؤتی میں ودیا مندر کے خلاف سخت رنج وافسوس کا اظہار کیا۔ غرض کہ ان مسلمانوں نے جو کانگریس سے بے تعلق ہیں اور نیز انھوں نے جو کانگریس میں شریک ہیں متفقہ طور پر ودیا مندر اسکیم کو ناقابلِ قبول ٹھیرایا۔

آپ کو غالباً یہ بھی معلوم ہے کہ صوبہ متوسط و برار کے مسلمان سیاسی حیثیت سے کئی ٹکڑیوں میں منقسم ہیں۔ لیکن جہاں تک ودیا مندر اسکیم کا تعلق ہے، سب فریق متحد ہیں۔ ایک ایسی مخالفت جس میں کانگریسی، لیگی فرقہ پرست، قوم پرست غیر جانب دار، عامی وعالم سب شریک ہوں۔ معمولی اور بیجا مخالفت نہیں کہی جاسکتی۔ یہ امر آپ کے غور کے قابل ہے

مسلمانوں کو ایک شکایت یہ بھی ہے کہ ودیا مندر اسکیم کے متعلق جتنی کمیٹیاں بنائی گئیں اُن میں صوبے کا کوئی مسلمان شریک نہیں کیا گیا۔ حالاں کہ ایسے مسلمان موجود تھے جو صوبے کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت سے پورے واقف تھے۔ مسٹر شکلا کو خود اس کا خیال کرنا چاہیے تھا۔ یہ اسکیم کے حق میں بھی مفید ہوتا اور انھیں بھی معلوم ہوجاتا کہ ان کی اسکیم کو ان کے مسلمان ہم وطن کس نظر سے دیکھتے ہیں۔

اب رہی یہ بات کہ مسلمانوں کے کیا مطالبے ہیں؟ سو اس کے متعلق

اس قدر لکھا جا چکا ہے کہ اس کا دہرانا ایک فضول سی بات معلوم ہوتی ہے۔ تاہم یاد دہانی کے لیے میں اُن کا خلاصہ یہاں درج کرتا ہوں۔

(۱) ودیا مندر کا نام بدل دیا جائے۔ آپ فرمائیں گے کہ نام میں کیا رکھا ہے؟ نہیں، نام میں بہت کچھ رکھا ہے۔ نام کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے۔ یہ نفسیاتی مسئلہ ہے اور آپ جیسے ماہرِ نفسیات سے اس کے متعلق کچھ عرض کرنا تحصیل حاصل ہے۔ مندر کے معنی اور جو کچھ بھی ہوں لیکن عام طور پر اس کے جو معنی سمجھے جاتے ہیں وہ ایک ایسے مذہبی مقام کے ہیں جہاں بتوں کی پوجا ہوتی ہے۔ اس نام میں مذہب اور فرقہ پرستی کا گہرا رنگ موجود ہے۔ اس بارے میں کسی بحث کی ضرورت نہیں۔ اسکیم کے فاضل مصنّف آنریبل مسٹر شکلا کے اپنے الفاظ علی الاعلان اس کی شہادت دے رہے ہیں وہ فرماتے ہیں:-

"اس نام میں ایک سے زیادہ کششیں موجود ہیں۔ دیہات میں ننانوے فی صدی کے لیے یہ نام روحانی ولولہ پیدا کرے گا۔"

وہ ایک سے زیادہ کون سی کششیں ہیں۔ 'روحانی ولولہ' سے کیا مطلب ہے؟ یہ ایسی کھلی بات ہے کہ اس میں بحث و تکرار کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ کانگریسی حکومت کو جو قوم پرستی کا دعویٰ کرتی ہے۔ اپنے کاموں اور کارناموں کو مذہبی اور فرقہ پرستی کا رنگ دینا کسی طرح جائز نہیں۔ میں نے مسٹر شکلا کو یہ مشورہ دیا تھا کہ اس وقت جو نام رائج ہیں اُنھیں میں سے کوئی نام اختیار کر لیں۔ اور اگر وہ اپنی محبوب اسکیم کے لیے کوئی نیا ہی نام رکھنا چاہتے ہیں تو "پڑھائی گھر" رکھ لیں۔ یہ خالص ہندی لفظ ہے اور کسی کو اعتراض بھی نہ ہوگا۔ لیکن انھیں کچھ ایسی ضد آپڑی ہے کہ کیسی ہی معقول بات ہو اُن کی سمجھ میں نہیں آتی۔ شاید آپ سمجھائیں تو وہ سمجھ جائیں۔

(۲) تعلیم کی زبان ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ودیا مندر اسکیم وردھا اسکیم کا بچہ ہے اور وہ وردھا اسکیم کے رواج دینے کے لیے ابتدائی تیاری کا کام دے گی ۔ وردھا اسکیم اب وہ نہیں رہی جو پہلے تھی ۔ اس کی آخری صورت میں یہ طے پایا ہے کہ صوبے کی زبان لازمی طور پر ذریعۂ تعلیم قرار دی جائے گی ۔ سی ۔ پی ، نیز دیگر صوبوں میں کئی کئی زبانیں رائج ہیں ۔ مسلمانوں کا یہ مطالبہ ہے کہ اُن کے بچوں کے لیے اُردو کا انتظام لازمی طور پر کیا جائے ۔

(۳) نصاب کی کتابیں ۔ اِس وقت سی پی کے مدرسوں میں جو کتابیں رائج ہیں ان میں تمام تر ہندو دیو مالا ، ہندو سورماؤں اور بزرگوں کا حال درج ہے مسلم تہذیب و ادب یا مسلمان بزرگوں کا نام تک نہیں ۔ اس پر اعتراض نہیں ہندو سورماؤں اور بزرگوں کا حال کیوں ہے ۔ بلکہ کہنا یہ ہے کہ اس کے ساتھ مسلمانوں کے بزرگوں یا ان کے کارناموں کا ذکر کیوں نہیں ہے ؟ اگر آپ ملک میں قومیت اور محبت و آشتی پیدا کرنا چاہتے ہیں تو اس کا یہ طریقہ نہیں ۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہماری نصاب کی کتابوں میں ہندو اور مسلم تہذیب اور ہندو اور مسلم بزرگوں کے حالات ساتھ ساتھ دیے جائیں تاکہ ہمارے طالب علموں کو ایک دوسرے کی تہذیب اور ایک دوسرے کے بزرگوں سے واقفیت ہو ۔ اور ان میں ہمدردی اور محبت کا جذبہ پیدا ہو ۔ مثال کے طور پر یہ عرض کرتا ہوں کہ انجمن ترقیِ اُردو ہند نے جو ریڈریں ریاست حیدر آباد کے مدرسوں کے لیے تیار کی ہیں ان میں اس امر کا خاص خیال رکھا گیا ہے ۔ اور وہ ایسی ہیں کہ کسی فرقے اور طبقے کو مطلق اعتراض نہیں ہو سکتا ۔ مسلمان اس امر کو گوارا نہیں کر سکتے کہ اِن کے بچّے اپنی تہذیب و آداب سے محروم رہیں ۔ اور کچھ اور ہی ہو جائیں ۔ یا تو مسلمان بچوں کے لیے ریڈروں کا الگ سلسلہ

ہو یا پھر وہ ریڈریں ایسی ہوں کہ وہ مسلمان بچوں کی تہذیبی ضرورت کو پورا کرسکیں ۔

(۴) مدرسوں کے قیام کی شرط ۔ ودیا مندر اسکیم کی رُو سے کسی گانو میں مدرسہ جاری کرنے کے لیے یہ شرط لازمی قرار دی گئی ہی کہ ایک میل کے گروے میں چالیس قابلِ تعلیم لڑکے لڑکیاں فراہم ہونے پر ایک مدرسہ قائم کیا جائے گا ۔ یہ ظاہر ہی کہ مسلمانوں کی آبادی سی ۔ پی میں اس قدر کم ہی کہ وہاں کے کسی گانو میں شاید ہی چالیس مسلمان پڑھنے والے بچّے مل سکیں گے ۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ یا وہ جاہل رہیں گے یا ہندی اسکولوں میں شریک ہوکر اپنی زبان اور تہذیب دونوں کو کھو بیٹھیں گے ۔ مسلمانوں کا مطالبہ یہ ہی کہ جہاں پانچ بچّے اُردو پڑھنے والے ہوں ۔ وہاں اُردو رسمِ خط میں ان کی تعلیم کا انتظام کیا جائے اور جہاں دس یا دس سے زیادہ ہوں وہاں اُن کے لیے مدرسہ قائم کیا جائے ۔

(۵) موجودہ اُردو مدرسے ۔ ایک مطالبہ مسلمانوں کا یہ ہی کہ صوبے میں جو اس وقت اُردو مدرسے موجود ہیں وہ بحالہٖ قائم رہیں ۔ یہ میں اس لیے کہتا ہوں کہ حال ہی میں صوبے کی حکومت نے بیتول کا اُردو مدرسہ بند کردیا حالاں کہ سارے ضلع میں صرف یہی ایک اُردو مدرسہ تھا ۔ جہاں (میں نے تحقیق کیا ہی) یہ عذر کہ طالب علموں کی تعداد کافی نہ تھی اس لیے بند کر دیا گیا (یا دوسرے لفظوں میں ہندی اسکول میں ضم کر دیا گیا) صحیح نہیں ۔ طالب علموں کی تعداد کافی تھی ۔ یہ بھی سننے میں آیا ہی کہ بعض دوسرے مقامات کے اسکول بھی بند کر دیے گئے ہیں ۔ اس سے صوبے کے مسلمانوں میں سخت بے چینی پھیلی ہوئی ہی ۔

انڈین نیشنل کانگریس کا یہ دعوا ہی کہ وہ اقلیتوں کی زبان و تہذیب کی محافظ ہی ۔ آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ جب میری انجمن کا نمایندہ قصبہ پانڈھرنا (ضلع چھندواڑہ) کے مدرسے میں پہنچا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے یہ دیکھا کہ اسکول شروع ہونے سے پہلے ہندو اور مسلمان لڑکے سرسوتی کی مورت کے سامنے ہاتھ جوڑکر پرارتھنا کر رہے ہیں، مسلمان لڑکے ان مدرسوں میں پڑھ کر سلام تک بھول گئے ہیں اور اب وہ سلام کی جگہ 'نمستے' اور 'رام جی کی جے' کہتے ہیں ۔ کیا زبان و تہذیب کی حفاظت کے یہی معنی ہیں ۔

مہاتما جی! ہم نے ہر جائز اور آئینی کوشش کر کے دیکھ لیا۔ ہماری تحریروں اور تقریروں، ہمارے جلسوں اور قراردادوں، ہمارے وفدوں اور گزارشوں کی کہیں شنوائی نہیں ہوئی ۔

سی۔ پی کے مسلمانوں نے اب تک صبر کیا ہی، لیکن اب ان کے صبر کا جام لبریز ہوتا نظر آتا ہی ۔ آپ سے یہ آخری گزارش ہی اور اگر اس کے بعد بھی کوئی شافی جواب نہ ملا تو میں آپ کو بصد ادب متنبہ کرتا ہوں کہ پھر مسلمانوں کو بجز اس کے کوئی چارہ کار نہ رہے گا کہ وہ آپ ہی کے ہتھیار آپ کے مقابلے میں استعمال کریں ۔

آپ کا مخلص

عبدالحق آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو

یاد رکھنے کی بات

مسٹر شکلا نے اپنی مطبوعہ اسکیم (ودیا مندر) میں یہ تسلیم کیا تھا کہ سارے ودّیا مندروں میں تعلیم مادری زبان کے ذریعے دی جائے گی، لیکن جب ان سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ مرہٹی اور ہندی ودّیا مندروں میں اُردو پڑھنے والے بچوں کی تعلیم کا انتظام اُن کی مادری زبان اُردو کے ذریعے کیا جائے تو شکلا جی کو عجیب پریشانی لاحق ہوئی، اِس نئی افتاد سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ۱۴ستمبر ۱۹۳۸ء کو ایک سرکاری بیان نکالا گیا جس میں مادری زبان کی تشریح ان لفظوں میں کی گئی :-

"مادری زبان سے مُراد اس علاقے کی اکثریت کی زبان ہی، جہاں اسکول واقع ہو۔"

بعض انصاف پسند ہندوؤں نے بھی شکلا جی کی اس نئی اُپج کے خلاف سختی سے نکتہ چینی کی، چنانچہ مسٹر رگھو وندراؤ آں جہانی سابق رُکن مجلس قانون ساز صوبہ متوسط و برار اور مشیر سکریٹری آف اسٹیٹس فار انڈیا (لندن) نے اس سلسلے میں جو تقریر کی اس کے بعض جملے درج ذیل ہیں :-

"انڈین نیشنل کانگریس نے اقلیتوں کو اُن کی مادری زبان کے ذریعے تعلیم دینے کا اعلان کیا ہی، لیکن موجودہ حکومت' انڈین نیشنل کانگریس کی اس پالیسی کے خلاف اقلیتوں کو اس زبان کے ذریعے تعلیم دینا چاہتی ہی جو اس علاقے کی اکثریت کی زبان ہی، جہاں وہ بستی ہیں۔ یہ کمیونٹی اقلیتوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کے حق سے محرُوم کرتا ہی اور انھیں علاقے کی اکثریت کی زبان کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے پر مجبور کرتا ہی۔"

اس ضمن میں مسٹر افتخار علی ایم - ایل - اے جبل پور نے تقریر کرتے ہوئے ثابت کیا کہ وردھا اسکیم میں بھی جس کی بُنیاد پر وِدّیا مندر اسکیم کا نصابِ تعلیم تیار کیا گیا ہو مادری زبان سے طالب علم کی زبان مُراد لی گئی ہو، نہ کہ علاقے کی اکثریت کی مادری زبان۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کارروائی مجلسِ قانون ساز صوبۂ متوسط و برار مورخہ ۱۶، ۱۷ ستمبر ۱۹۳۸ء صفحہ ۵۵ - ۶۰ اور ۱۳۹ - ۱۴۴ مطبوعہ گورمنٹ پریس ناگ پور۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی حمایت

وِدّیا مندر اسکیم کے خلاف ایجی ٹیشن جاری ہی تھا کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ایک نئے انداز سے صوبۂ متوسط و برار کی کانگریسی حکومت کو تقویت دینی چاہی۔ ایک لمبا چوڑا مضمون جو اعداد و شمار کے بوجھ سے گراں بار تھا مُلک بھر کے اُردو، ہندی اور انگریزی اخبارات میں شائع کیا گیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ صوبۂ متوسط و برار کی کانگریسی وزارت نہ صرف انصاف پسند ہی بلکہ رواداری اور "ضرورت سے زیادہ" فراخ دل بھی ہی۔ اِس نازک موقع پر بھی ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب بدستور سابق ہمارے کام آئے اور آپ نے بڑی تحقیق و تفتیش کے بعد ثابت کر دیا کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے جن احسانات کا سہرا سی۔ پی کی کانگریسی حکومت کے سر باندھنے کی کوشش کی تھی، وہ سب اگر احسانات ہی ہیں تو ان کا تعلق اُن حکومتوں سے تھا جو صوبے میں کانگریس کی حکومت سے پہلے تھیں، ڈاکٹر صاحب موصوف کے مضمون سے جس کا عنوان "آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی غلط بیانی اور سی۔ پی وزارت کے کارناموں کی فرضی کہانی" تھا، یہاں ایک مختصر اقتباس

پیش کیا جاتا ہے، آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اس بیان کے مطابق سی۔ پی کی کانگریسی حکومت کی طرف سے مسلمانوں کو حسبِ ذیل تعلیمی وظیفے ملتے تھے :۔

(۱) تین رُپے ماہانہ کے ۹ وظیفے ــــــ مڈل اسکول کے طلبہ کے لیے

(۲) پانچ رُپے ماہانہ کے ۸ وظیفے ــــــ ہائی اسکول کے طلبہ کے لیے

(۳) پانچ رُپے ماہانہ کے ۱۴ وظیفے ــــــ اُردو نارمل اسکول سے متعلق پریکٹسنگ اسکول کے لیے۔

(۴) تیرہ رُپے ماہانہ کے ۲۰ وظیفے ــــــ اُردو نارمل اسکول امراؤتی کے لیے

(۵) دس رُپے ماہانہ کے ۱۰ وظیفے ــــــ زنانہ گورمنٹ نارمل اسکول جبل پور میں اردو زبان میں ٹریننگ حاصل کرنے والی طالبات کے لیے۔

(۶) اس کے علاوہ عام مقابلے کے ذریعے مُسلم طلبہ کو علاحدہ وظیفے مل سکتے ہیں (اور ملتے ہیں)

اب اِن وظیفوں کا کچّا چٹھا ڈاکٹر صاحب کی زبان سے سُنیے :۔

"نمبر ۱ کے وظائف کا تعلق ۱۹۱۸ء سے ہے۔ ملاحظہ ہو اسٹینڈنگ آڈر صفحہ ۱۳۴ نمبر ۹۳۰۸ مورخہ ۴ فروری ۱۹۱۸ء اور نمبر ۱۱۶۲ مورخہ ۸ فروری ۱۹۱۸ء۔

نمبر ۲ اور نمبر ۳ کے وظیفے بھی ۱۹۱۸ء کے جاری کردہ ہیں۔ سکرٹریٹ نمبر ۹۸ ۔۴۔ اے۔ (۱) صفحہ ۱۳۷ مورخہ ۵ فروری ۱۹۱۸ء۔

نمبر ۴ کے وظیفے ۱۹۱۷ء میں وجود میں آئے۔ نمبر ۵۹۰۱ مورخہ ۴ ستمبر ۱۹۱۷ء۔

نمبر ۵ کے وظیفے اپریل ۱۹۳۷ء میں منظور ہوئے جب کہ ابھی صوبے میں کانگریسی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی۔ ملاحظہ ہو نمبر ۶۲۴ مورخہ ۱۹ اپریل ۱۹۳۷ء۔

نمبر ۶ امتحانِ مقابلہ میں شریک ہوکر وظیفہ حاصل کرسکنے کی رعایت بہت ہی دل چسپ ہے۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اس ضمن میں اُن ۳۲۳ درس گاہوں کا ذکر کیا ہی جو مسلمانوں کے لیے مخصوص ہیں - ملحوظ خاطر رہے کہ ان ۳۲۳ درس گاہوں میں صوبے بھر کے ابتدائی اور ثانوی مدرسے شامل ہیں - یہ بھی صحیح نہیں کہ یہ ۳۲۳ درس گاہیں مسلمانوں کے لیے مخصوص ہیں - بات صرف اتنی ہی کہ ان درس گاہوں میں اُردو پڑھائی جاتی ہی - اگر اُردو درس گاہوں کی تخصیص مسلمانوں کے ساتھ جائز ہوسکتی ہی تو صوبہ بھر کے وہ سب اسکول جن میں مرہٹی اور ہندی پڑھائی جاتی ہی خالص ہندو اسکول کہے جائیں گے - سمجھ میں نہیں آتا کہ جب اِن ۳۲۳ درس گاہوں میں ایک بھی کانگریسی وزارت کا قائم کیا ہوا نہیں تو کس بنا پر اِن کے وجود یا قیام کو سی - پی کی کانگریسی وزارت کے کارناموں میں شمار کیا گیا -

اسی بیان میں "تعلیمی اداروں کی امداد" کے عنوان کے تحت میں اٹھارہ مسلم اسکول گنائے گئے ہیں - جن میں کانگریسی وزارت امداد دے رہی تھی - یہ معلوم کرنا دل چسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ان اسکولوں میں سے ایک کی بھی امداد کانگریسی حکومت کی رہینِ منت نہیں، بلکہ یہ سب امداد پچھلی حکومتوں کے عہد سے جاری ہی - اِس وقت صوبے کے امدادی مدارس کو لڑکوں کی تعلیم کے لیے حکومت تین لاکھ گیارہ ہزار تین سو بچاسی رُپی دے رہی ہی - اِس رقم میں سے اُردو کا حصہ صرف پچیس ہزار سات سو پچیس رُپی ہو - اِس امداد کی وقعت اور بھی کم ہوجاتی ہی جب ہم صوبے کے سرکاری مدارس پر ایک نظر ڈالتے ہیں، جن میں سے دو ایک کو چھوڑ کر سب ہندی اور مرہٹی پڑھنے والے طلبہ کے لیے مخصوص ہیں - چھوٹے شہروں اور قصبوں کا تو ذکر ہی کیا، ناگ پور اور جبل پور جیسے مرکزی مقامات کے سرکاری مدارس میں بھی اُردو کا نام و نشان نہیں -

لڑکیوں کے امدادی مدارس کو باون ہزار دو سو آٹھ رُپی دیے جاتے ہیں -

ان میں اُردو پڑھنے والی طالبات کا حصّہ صرف دو ہزار دو سو نوّے روپے ہی۔ یہ اعداد و شمار صاف ظاہر کر رہے ہیں کہ سی۔پی کی کانگریسی حکومت مسلمانوں کی طرف سے کس درجہ تغافل برت رہی ہی۔ اس پر بھی بڑے فخر و مباہات کے ساتھ کہا جاتا ہی کہ کانگریس اور اُس کی وزارت مسلم اقلیت کی بہترین رفاقت اور دوستی کا ثبوت دے رہی ہی"۔

قصہ مختصر "ودّیا مندر" اسکیم نے جو آگ لگائی تھی، وہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے مذکورہ بالا بیان اور پھر اس کا پول کھل جانے کے بعد اور بھی شدت کے ساتھ بھڑکی۔ پورے ڈیڑھ سال کے مسلسل ایجی ٹیشن کے بعد جب شُکلاجی اور اُن کی حکومت ٹس سے مس نہ ہوئی تو بہ مصداق "تنگ آمد بہ جنگ آمد" صوبۂ متوسط و برار کے حامیانِ اُردو نے مجبور ہو کر اُسی حربے کو ہاتھ میں لیا، جو خود کانگریس کی ایجاد ہی۔ یعنی ۲۶ر جنوری ۱۹۳۹ء کو اُنھوں نے نواب صدیق علی خاں صاحب ایم۔ایل۔اے ناگ پور کی قیادت میں سول سکریٹریٹ ناگ پور کے سامنے قانون شکنی کا آغاز کر دیا۔ آخر ۷، ۸ر فروری ۱۹۳۹ء کو نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب آنریری سکریٹری آل انڈیا مسلم لیگ کی موجودگی میں صوبے کے مسلم اراکین اسمبلی اور مسٹر شکلا وزیر تعلیم صوبۂ متوسط و برار کے درمیان ایک معاہدہ ہوا اور قانون شکنی بند کر دی گئی۔

معاہدے کی تفصیلات میں پڑنے کی بجائے صرف یہ معلوم کرنا کافی ہوگا کہ اس معاہدے کی رُو سے صوبۂ متوسط و برار کی کانگریسی حکومت نے ہندو طلبہ کے لیے تو بجنسہٖ ودّیا مندر اسکیم باقی رکھی اور مسلمان طلبہ کو مدینۃ العلم اسکیم کا تحفہ مرحمت فرمایا۔ کیا سی۔پی کی کانگریسی حکومت کے اس فیصلے کی روشنی میں

بھی متحدہ ہندستان کا وجود باقی رہ جاتا ہی ؟

کاش کانگریس کے اربابِ حل وعقد اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرتے۔

جیسا کہ اوپر کے مضامین اور اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہی" اکھل بھارتیہ ساہتیہ پریشد" کے اجلاس ناگ پور اور بعد میں ودّیا مندر اسکیم اور اُس کے متعلقات نے ناگ پور اور صوبہ متوسط و برار کو لسانی نزاع کا مرکز بنا دیا۔ صوبہ متوسط و برار کے حامیانِ اُردو کی سرگرمیوں کا دائرہ بے حاصل شور وشغب اور خواہ مخواہ کے ہنگاموں تک محدود نہ رہا۔ وہ تعمیری کاموں سے بھی غافل نہ رہے اُردو کی تبلیغ واشاعت کے لیے جو کچھ بھی وہ کر سکتے تھے انھوں نے کیا۔ اُردو کے خانگی مکاتب کھولے بالغوں کے لیے شبینہ مدارس قائم کیے اور مختلف مقامات پر دارالمطالعے اور کتب خانے قائم کیے۔ اپنی تحریکات کو تقویت دینے کے لیے انھوں نے ۲۳ر اکتوبر ۱۹۳۸ء اور ۴ر مارچ ۱۹۴۰ء کو اعلیٰ پیمانے پر انجمنِ ترقیِ اُردو ہند کی سرپرستی اور رہ نمائی میں دو صوبائی کانفرنسیں منعقد کیں۔ دونوں کانفرنسوں کی صدارت ہماری زبان و ادب کے سب سے بڑے محسن ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب آنریری سکریٹری انجمنِ ترقیِ اُردو ہند نے فرمائی۔ ہمارے لیے یہ فخر کچھ کم نہیں کہ ڈاکٹر صاحب ممدوح نے ہماری خدمات کو سراہا اور ایسے نازک وقت میں ہماری دست گیری اور حوصلہ افزائی کی جب کہ ہمیں اس کی بے حد ضرورت تھی۔ ۲۳ر اکتوبر ۱۹۳۸ء کی صوبہ اُردو کانفرنس میں آپ نے جو خطبہ دیا، اُس کے یہ الفاظ ہمیشہ ہماری ہمت بڑھاتے رہیں گے، اور اُس کے ذریعے ہم اپنے اندر ایک نئی رُوح پھونکتے رہیں گے :-

"حضرات! آپ نے جس استقلال اور جواں مردی سے اپنی زبان کی حمایت کی ہی، اُس کی داد میں کیا دوں گا۔ سارا ہندستان دے گا۔ دُوسرے باتیں کرتے ہیں آپ نے کر دکھایا۔ دُوسرے تقریریں کرتے ہیں اور آپ نے عمل کر کے بتا یا۔

آپ کا یہ مسئلہ صرف سی۔پی کا مسئلہ نہیں رہا، بلکہ سارے ہندستان کا مسئلہ ہو گیا ہی، اور آپ کی مثال سارے ہندستان کے لیے نظیر ہوگی، یہ آپ کی وقت شناسی اور مصلحت اندیشی کی دلیل ہی کہ آپ نے ایسے وقت اُردو کانفرنس کا انعقاد کیا ہی۔ دنیا میں قابلِ قدر اور کام یاب وہی ہوئے ہیں، جو وقت کو پہچانتے اور اس کے مطابق کام کرتے ہیں۔ یہ عجیب اتفاق کی بات ہی کہ وہ مسئلہ جو سارے ہندستان کا مسئلہ ہی اور وہ زبان جس کا جنم بھوم شمالی ہند ہی، اس کا فیصلہ سی۔پی کی سرزمین میں ہو رہا ہی۔ سی۔پی اکثر اعتبارات سے سیاسی، لسانی، تعلیمی معاشیاتی مسائل کا مرکز ہو گیا ہی اور یہاں سے چند میل کے فاصلے پر برِاعظم ہند کے نہایت سنجیدہ اور نازک مسائل طی ہوئے ہیں اور انشاءاللہ یہیں ہمارے لسانی اور تعلیمی مسائل بھی (علی الرغم شکلا) طی پائیں گے اور ہم طی کر کے رہیں گے اور جب تک انصاف اور عزت کے ساتھ طی نہ ہوں گے ہم برابر جدوجہد کرتے رہیں گے اور لڑتے رہیں گے ؎

دست از طلب نہ دارم تا کامِ من بر آید یا جاں رسد بہ شکلا یا جاں ز تن بر آید"

۴ر مارچ ۱۹۴۲ء کو صوبہ اُردو کانفرنس ناگ پور میں ڈاکٹر صاحب ممدوح نے جو خطبۂ صدارت پڑھا، اُس کی ابتدا آپ یوں فرماتے ہیں:۔

ای حضرات! اگرچہ آپ کے شہر کا نام ناگ پور یعنی ناگوں بھرا ہی، لیکن یہ مجھے بہت عزیز ہی، اس لیے کہ یہیں مجھے وہ بیش بہا سبق ملا ہی، جسے میں کبھی نہیں بھول سکتا، یہیں وہ واقعہ پیش آیا ہی جسے اب ایک گونہ تاریخی حیثیت حاصل ہو گئی ہی اور جس نے ہماری تحریک میں قوت پیدا کر دی اور ملک کے اُردو داں طبقے کی آنکھیں کھول دیں۔ میں اس واقعے کا ذکر ہمیشہ شکر گزاری کے ساتھ کرتا ہوں اور جب تک زندہ ہوں اسے شکر گزاری کے ساتھ یاد کروں گا، میں اسے اب ناگ پور نہیں جاگ پور کہتا ہوں، کیوں کہ اِس نے مجھے اور آپ کو جگایا ہی۔"

یہ خودستائی نہیں بلکہ اظہارِ حقیقت ہے کہ ہم ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء سے پہلے بھی ناگ پور کو اُردو کا مرکز سمجھتے تھے، لیکن جب سے ہمارے محسن ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب اور انجمنِ ترقی اُردو ہند نے ہمارے شہر اور صوبے کی طرف توجہ کی، اُس کی عظمت اور اہمیت کہیں بڑھ گئی ہے۔ بڑی ناشکری ہوگی اگر ہم ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی کرم فرمائیوں اور انجمنِ ترقیِ اردو ہند کی توجہات کا شکریہ نہ ادا کریں۔ اگر ڈاکٹر صاحب کی دلچسپیاں اور ہمدردیاں اِس صوبے کے اُردو والوں کے شاملِ حال نہ ہوتیں تو اس سنگلاخ میدان کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔ متعدد بار اس پیرانہ سالی کے باوجود آپ ناگ پور اور جبل پور تشریف لائے۔ آپ ہی کے ارشاد اور ہدایت پر علی شبّر صاحب حاتمی اور اسرار حسین صاحب نے پورے صوبۂ متوسط و برار کا دورہ کیا اور صوبے میں اُردو کے متعلق مفید معلومات فراہم کیں جگہ جگہ انجمن ترقی اُردو کی شاخیں اور شبینہ مدارس قائم کیے۔ اِن دونوں صاحبوں کے دورے کی مفصل رپوٹ چھپ چکی ہے۔ حکیم اسرار احمد صاحب کریوی نے بھی کئی سال تک انجمن کی طرف سے اس صوبے میں کام کیا اور اردو کے تحفظ اور اس کی تبلیغ و اشاعت کے لیے بڑی کوششیں کیں۔

کانفرنس کی دعوت

پچھلے تین چار سال سے ناگ پور میں اشاعتِ اُردو کے نام سے ایک ادبی انجمن قائم تھی۔ یہ انجمن اپنی بساط کے مطابق ادبی جلسے، مشاعرے اور مقالات کی مجلسیں منعقد کرتی رہتی تھی۔ اس انجمن نے اکتوبر ۱۹۴۳ء میں ایک صوبہ کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کیا، لیکن چوں کہ اس سے پہلے ناگ پور میں دو صوبہ اردو کانفرنسیں منعقد ہو چکی تھیں لہٰذا اراکین نے اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کی اور ایک غیر معمولی اجلاس طلب کر کے

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب آنریری سکریٹری انجمنِ ترقیِ اُردو (ہند) کو ناگ پور میں ۱۹، ۲۰، ۲۱ر جنوری ۱۹۴۴ء کو تیسری کُل ہند انجمنِ ترقیِ اُردو کانفرنس منعقد کرنے کی دعوت دی اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی طے کیا کہ انجمنِ اشاعتِ اُردو کو ختم کر کے مضبوط پیمانے پر صوبائی انجمنِ ترقیِ اُردو کا قیام عمل میں لایا جائے۔ اور پھر اس کے تحت صوبے کے ہر مقام پر انجمنِ ترقیِ اُردو کی باکار اور سرگرمِ عمل شاخیں قائم کی جائیں۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے انجمن اشاعتِ اُردو کی دعوت کو قبول فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب ممدوح کی منظوری موصول ہونے پر کانفرنس کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ مجلسِ استقبالیہ کے اراکین بنائے گئے اور جب اُن کی تعداد تین سو کے قریب پہنچ گئی تو ۵ر دسمبر ۱۹۴۳ء کو مجلسِ استقبالیہ کے دفتر بھنڈارہ روڈ ناگ پور میں مجلس استقبالیہ اور مختلف سب کمیٹیوں کے عہدہ داروں کا انتخاب عمل میں آیا۔ انجمن ترقیِ اُردو ناگ پور کے قدیم سرپرست جناب نواب محی الدین خاں صاحب ایم۔ ایل۔ اے رئیسِ اعظم ناگ پور صدر اور خاکسار مرتب کو سکریٹری منتخب کیا گیا۔ جناب فیض انصاری اور عبدالستار اشرفی صاحب جوائنٹ سکریٹری اور جناب مرزا مسعود بیگ صاحب خازن مقرر ہوئے سہولتِ کار اور تقسیمِ عمل کے لیے حسبِ ذیل کمیٹیاں بنائی گئیں:-

مالیاتی سب کمیٹی:-

جناب حاجی آدم کی — صدر

جناب مرزا اسمٰعیل بیگ صاحب — سکریٹری

اراکین۔ نواب صدیق علی خاں صاحب ایم۔ ایل۔ اے۔ جناب مولوی عبدالباقی خاں صاحب ایم۔ اے۔ جناب عباس علی صاحب کمال بی۔ اے۔ جناب حاجی خواجہ میاں صاحب مال گزار۔ جناب حکیم اسرار احمد صاحب کریوی۔ مرزا وزیر بیگ صاحب میکانیکل انجینیر ماڈل ملس ناگ پور۔ جناب سید

ریاض الدین صاحب بی-اے، ال ال بی۔

پنڈال سب کمیٹی :-

جناب کریم الدین صاحب الکٹرک انجنیر اینڈ کنٹریکٹر — صدر

جناب سیٹھ عبدالستار صاحب صدیقی بی، اے آنرز — سکریٹری

اراکین :- جناب مرزا وزیر بیگ صاحب۔ جناب سید ابو الحسن صاحب ناسق۔ جناب سید یوسف علی صاحب۔ جناب محمد طیب انصاری صاحب۔

قیام وطعام سب کمیٹی :-

جناب حکیم اسرار احمد صاحب کریوی — صدر

جناب منشی محمد حبیب اللہ خاں صاحب آفریدی — سکریٹری

اراکین :- جناب منشی منیر الدین صاحب۔ جناب محمد حبیب اللہ صاحب۔ جناب سلطان احمد صاحب کھوکھر۔ جناب کالے خاں صاحب۔ جناب محمد حنیف صاحب بزمی۔

مشاعرہ سب کمیٹی :-

جناب مولوی عبدالسلام صاحب فاروقی ایڈوکیٹ ناگ پور — صدر

جناب منور حسین صاحب شاکر اورنگ آبادی اور جناب سرفراز خاں صاحب — سکریٹری

اراکین :- جناب طرفہ قریشی۔ جناب شاطر کلیمی کامٹوی۔ جناب حمید ناگ پوری۔ جناب حیرت لدھیانوی۔ جناب مرزا آغا حسین صاحب آغا۔ جناب محمد فیاض الدین صاحب صوبے دار۔ حکیم سید ریاض الحسن صاحب۔

نشر و اشاعت سب کمیٹی :-

جناب منشی یعقوب علی صاحب — صدر

جناب صادق حسین صاحب صدیقی — سکریٹری

اراکین :- مسٹر کشن لال سب ایڈیٹر نو بھارت - احمد اللہ خاں صاحب بی - اے
جناب عارف محمد خاں صاحب عآرف -

مقالات سب کمیٹی :-

جناب عبدالستار صاحب فاروقی ایڈیٹر الفاروق کامٹی — صدر
جناب عقیل حسین صاحب ایم - اے - اِل اِل - بی — سکریٹری

اراکین :- جناب عبدالسلام خاں صاحب ایم - اے ، بی - ٹی - جناب یوسف قریشی صاحب -

نمائش سب کمیٹی :-

جناب محمد فیاض الدین صاحب صوبے دار — صدر
جناب شارب قریشی — سکریٹری

اراکین :- جناب تفضل حسین صاحب قریشی - جناب مرزا آغا حسین صاحب - جناب
عبدالصبور صاحب - محترمہ فہمیدہ پروین صاحبہ - جناب یوسف جمال صاحب -
محترمہ سعیدہ اشرف صاحبہ -

رضاکار سب کمیٹی :-

جناب سیٹھ عبدالغفور صاحب کیپٹن خالدی والنٹیر کور — صدر
جناب تفضّل حسین صاحب قریشی — سکریٹری

اراکین :- محمد یعقوب صاحب - خواجہ طاہر اللہ صاحب - پروفیسر شیخ لعل صاحب -
سید امجد علی صاحب - محمد یونس صاحب -

طبی سب کمیٹی :-

جناب حکیم سید ریاض الحسن صاحب — صدر
جناب ڈاکٹر احمد سلطان خاں صاحب نشتر — سکریٹری

اراکین :- جناب ڈاکٹر خان صاحب - محترمہ بیگم ڈاکٹر خان صاحب - ڈاکٹر

عبدالقدیر صاحب۔ ڈاکٹر سترما صاحب دید۔ حکیم قاضی ظہیرالدین صاحب۔

شعبۂ خواتین:۔

محترمہ بیگم سمیع اللہ خاں صاحب	صدر مجلسِ استقبالیہ
محترمہ بیگم یار محمد خاں صاحب	سکریٹری

شعبۂ خواتین کی طرف سے دو جلسے تجویز کیے گئے۔ جلسۂ عام اور جلسۂ مقالات۔ جلسۂ عام کی صدارت کے لیے محترمہ پروفیسر خورشید آرا بیگم صاحبہ منشی فاضل کو منتخب کیا گیا اور اس کا انجام محترمہ فہمیدہ پروین صاحبہ نے اپنے ذمّے لیا۔

جلسۂ مقالات کی صدارت کے لیے بیگم صاحبہ خان بہادر اعز الدین صاحب منتخب ہوئیں اور اس کا اہتمام بیگم صاحبہ محمود الحسن صدیقی بی۔ اے کے تفویض کیا گیا۔

مجلس انتظامیہ، مجلس استقبالیہ کے صدر، سکریٹری، جوائنٹ سکریٹری، خازن، اور مختلف سب کمیٹیوں کے صدر اور سکریٹری اور مالیاتی سب کمیٹی کے جملہ اراکین پر مشتمل بنائی گئی۔

مجلس استقبالیہ کے مشورے سے جناب ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند نے الحاج نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خاں شیروانی رئیس اعظم حبیب گنج علی گڑھ سے اس تاریخی اجلاس کی صدارت کی درخواست کی، جسے موصوف نے بخوشی قبول فرمایا۔ کانفرنس کی افتتاح کے لیے نواب مرزا یار جنگ بہادر ایجنٹ برار ناگ پور سے گزارش کی گئی، جسے ممدوح نے بہ طیب خاطر قبول فرمایا۔

مجلس استقبالیہ کے عہدہ داروں کے انتخاب اور سب کمیٹیوں کے بن جانے پر کانفرنس کا کام اور تیزی اور سرگرمی سے ہونے لگا۔ جناب ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی ہدایت پر جناب حکیم اسرار احمد صاحب کریوی دو مہینے

پہلے ہی ناگ پور آ گئے۔ ۲۹ر دسمبر ۱۹۴۳ء کو جناب مولوی حامد علی صاحب ندوی اور جناب خیر بھوروی نمایندہ انجمن ترقی اردو ہند بھی پہنچ گئے۔ ان دونوں بزرگوں نے مجلس استقبالیہ کے دفتری کام میں جناب صادق حسین صاحب صدیقی سکریٹری نشر و اشاعت کمیٹی کا ہاتھ بٹایا اور صوبے کے مختلف مقامات کے دورے بھی کیے۔ جناب طیب انصاری نے بھی کانفرنس کے سلسلے میں پورے صوبے کا مفصل دورہ کیا۔

کانفرنس کی شرکت کے لیے جناب ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ، اور جناب محی الدین خاں صاحب صدر مجلس استقبالیہ کی طرف سے ہندستان کے مشاہیر علم و ادب کو مطبوعہ دعوت نامے اور خطوط بھیجے گئے۔ مشاعرہ سب کمیٹی کی طرف سے ملک کے ممتاز اور خوش گو شاعروں کو مدعو کیا گیا۔ مجلس نشر و اشاعت کی طرف سے کانفرنس کے اغراض و مقاصد کے متعلق اخبارات میں مناسب اعلانات شائع کیے گئے۔

کانفرنس کے اجلاس کے لیے صدر بازار اردو پارک ناگ پور میں ایک موزوں جگہ کا انتخاب کیا گیا، اور ۸ر جنوری ۱۹۴۴ء سے پنڈال کے نصب کرنے کا کام پنڈال سب کمیٹی کے تحت سرگرمی سے شروع ہو گیا۔ پنڈال میں تقریباً ۱۵ ہزار آدمیوں کی نشست کا انتظام کیا گیا تھا۔ شہ نشین پر ۲۵۰ آدمیوں کے لیے گنجایش رکھی گئی تھی۔ مستورات کے لیے پردے کا معقول انتظام تھا۔ نمایندگاں کے لیے انجمن بورڈنگ اور صوبے سے باہر کے آئے ہوئے مہمانوں کے لیے پنڈال سے متصل ہی انجمن گرلس ہائی اسکول میں قیام و طعام کا انتظام کیا گیا تھا۔

۱۶ر جنوری ۱۹۴۴ء کو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب ناگ پور تشریف فرما ہوئے۔ دوسرے مہمانوں کی آمد کا سلسلہ بھی ۱۷ر جنوری ۱۹۴۴ء سے شروع ہوا، جو ۲۱ر جنوری ۱۹۴۴ء کی شام تک جاری رہا۔

۱۸ر جنوری ۱۹۵۸ء کی شام کو کانفرنس کے صدر منتخب الحاج نواب صدر یار جنگ مولانا محمد حبیب الرحمان خاں صاحب شیروانی ناگ پور تشریف لائے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب اور مجلس استقبالیہ کے اراکین اور معززین شہر نے اسٹیشن پر آپ کا استقبال کیا اور ہار پہنائے۔ نواب صاحب کے قیام کا انتظام نظام ہاؤس میں کیا گیا۔

گرلس ہائی اسکول میں ٹھیرے ہوئے مہمانوں کے قیام وطعام کا انتظام مجلس استقبالیہ کی طرف سے طعام وقیام سب کمیٹی نے بڑی عمدگی سے کیا۔ مولوی حامد علی صاحب ندوی نے مہمانوں کو ہر ممکن آرام پہنچانے کے لیے دن رات جس خلوص و سرگرمی سے کام کیا، پوری مجلسِ استقبالیہ بے حد شکر گزار ہے۔ نمایندگانِ صوبے کا انتظام جناب خیر بھوروی صاحب اور طیب انصاری صاحب نے کیا اور حق تو یہ ہے کہ حق ادا کر دیا۔

مہمانوں کو اسٹیشن سے اُن کی قیام گاہ تک پہنچانے کی ذمّے داری رضاکار سب کمیٹی کے علاوہ جناب رمضان خاں صاحب اسکاؤٹ ماسٹر انجمن ہائی اسکول ناگ پور اور جناب علی شبّر صاحب حاتمی بی، ایس سی نے اپنے ذمّے لی۔ یہ کام اگرچہ آسان نہ تھا لیکن بڑی حسن وخوبی سے انجام پایا۔

ہم انجمن ہائی اسکول کے ذمّے دار اصحاب اور جناب ہیڈ ماسٹر صاحب کے بھی بدل ممنون ہیں کہ انھوں نے انجمن ہائی اسکول کا ہال اور بورڈنگ کے کمرے کانفرنس کو مرحمت فرمائے اور بہ وقتِ ضرورت مناسب سامان اور فرنیچر بھی عطا کیا۔

محترمہ بیگم سمیع اللہ خاں صاحب کا جس قدر بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔ گرلس ہائی اسکول کی سکریٹری کی حیثیت سے آپ نے پانچ دن کے لیے اسکول بند کر دیا اور اسکول کی عمارت مہمانانِ کانفرنس کے لیے وقف کر دی۔

ہم مسٹر نرونا ڈپٹی کمشنر ناگ پور و گنزلر آفیسر کے بھی ممنون ہیں کہ موصوف نے

مہمانانِ کانفرنس کی ضروریات کا لحاظ رکھتے ہوئے کافی خورد و نوش کے سامان کی خریداری کا اجازت نامہ مرحمت فرمایا۔ سول اسٹیشن سب کمیٹی ناگ پور میونسپلٹی اور فائر بریگیڈ ناگ پور نے حفظانِ صحت اور حفظِ ماتقدم کے لیے کارکنانِ کانفرنس سے مکمل اشتراک کیا جس کے ہم شکر گزار ہیں۔ اگرچہ کانفرنس کا ہر شعبہ اپنی مستعدی اور حسنِ انتظام کے لحاظ سے آپ اپنا نمونہ تھا لیکن پنڈال کی تنصیب و تعمیر میں جو اعلیٰ حُسن کاری کا جلوہ نظر آتا تھا وہ حقیقت میں جناب مرزا وزیر بیگ صاحب میکانیکل انجنیر، جناب کریم الدین صاحب الکٹریکل انجنیر، جناب ماسٹر رفعت صاحب، عبدالرزاق صاحب ٹھیکیدار اور عبدالوہاب صاحب کی شبانہ روز ان تھک کوششوں کا نتیجہ تھا۔ امپرس ملس ناگ پور اور ماڈل ملس ناگ پور کے مینیجر صاحبان کا شکریہ ادا کرنا بھی ہمارا اہم اور خوش گوار فریضہ ہے کہ دونوں صاحبوں نے اپنے ملوں کے خوب صورت شامیانے کانفرنس کو مرحمت فرمائے۔

مولوی عبدالجبار صاحب انجمن ترقی اُردو ناگ پور کے بہت پرانے مخلص اور خاموش کارکن ہیں۔ موصوف نے کانفرنس کے ہر کام میں اس طرح ہاتھ بٹایا کہ گویا یہ انھیں کا کام تھا۔

نواب محی الدین خاں صاحب، نواب صدیق علی خاں صاحب ایم۔ ایل۔ اے اور جناب مرزا مسعود بیگ صاحب نے رقوم کی فراہمی کے لیے جو کوششیں فرمائیں لائق ستایش ہیں۔

صادق حسین صاحب صدیقی نے نشر و اشاعت کے سکریٹری کی حیثیت سے کانفرنس کی کام یابی کے لیے مہینوں جس ذوق و شوق اور انہماک سے کام کیا، وہ ہمارے نوجوانوں کے لیے قابلِ تقلید اور مشعلِ راہ ہے۔ میں اپنے رفقاء کار رئیس انصاری اور عبدالستار اشرفی کا بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے ہر موقع پر اور ہر کام میں میری مدد کی۔

جناب مرزا اسمٰعیل بیگ صاحب نے مالیاتی سب کمیٹی کے سکریٹری کی حیثیت سے قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ بجٹ کی تیاری اور ٹکٹوں کی فروخت وغیرہ کا سارا انتظام آپ کی نگرانی میں انجام پایا۔

یہ رپورٹ نا تمام رہ جائے گی، اگر شعبۂ خواتین کی اُس دل چسپی کا فراخ دلی سے اعتراف نہ کیا جائے جو اُسے آغازِ کار سے آخر وقت تک کانفرنس کے ساتھ رہی خصوصاً محترمہ فہمیدہ پروین صاحبہ نے جس توجہ، خلوص اور سرگرمی سے کام کیا ہم سب کے لیے باعثِ فخر و مباہات ہے۔

مرکزی انجمنِ ترقیٔ اُردو کی عنایات اور ہدایات سے بھی ہم برابر مستفید ہوتے رہے۔ کانفرنس کے دعوت نامے، پوسٹر اور دوسرے اعلانات مرکزی انجمن ہی نے چھپوا کر بھیجے۔ انجمن مذکور کے مہتمم جناب صلاح الدین صاحب جن کا تعلق ناگ پور سے دیرینہ اور مخلصانہ ہے، ہمارے بہترین معاون ثابت ہوئے اور باوجود دوری کے ہمیں اپنے مفید مشوروں سے نوازتے رہے۔ کانفرنس کے بعد بھی آپ دو تین دن ناگ پور میں مقیم رہے اور جانے سے پہلے آپ نے کارکنانِ کانفرنس کو ماؤنٹ ہوٹل میں عصرانہ پر مدعو کیا، جہاں آیندہ طریق کار کے متعلق تبادلۂ خیالات ہوا۔

صوبۂ متوسط و برار میں آج اُردو کا جو ذوق و شوق پیدا ہوگیا ہے، یہ کانفرنس اُس کا بہترین ثبوت تھی اور یہ ایک کھُلی ہوئی حقیقت ہے کہ اِس ذوق و شوق پیدا کرنے کا سہرا ہمارے اور زبانِ اُردو کے سب سے بڑے محسن ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب مدظلہٗ کے سر ہے۔ ہم اپنے شکر گزاری کے جذبے کو اس مشہور شعر کے ذریعے واضح کرنے پر اکتفا کرتے ہیں ؎

یک چراغ ست دریں بزم کہ از پرتوِ او
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

صوبائی انجمن ترقیٔ اُردو کی تشکیل

۱۹ر جنوری ۱۹۶۴ء کو ٹھیک ۵ بجے شام کے وقت نمایندوں کا جلسہ شروع ہوا۔سی۔پی و برار کے مختلف اضلاع سے تقریباً ڈھائی سو نمایندے شریکِ جلسہ ہوئے۔ اِس گرانی اور پریشانی کے عالم میں "اُردو زبان" ایسی خشک اور غیر ہنگامی چیز کے لیے اِن نمایندوں کا صوبے کے مختلف اضلاع سے اپنے خرچ پر آنا اور فیس نمایندگی ادا کر کے جلسے میں شریک ہونا بلاشبہ ایک معجزے سے کسی قدر کم نہیں۔

نمایندوں کا جلسہ بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی زیرِ صدارت ہُوا۔حکیم اسرار احمد صاحب نے جن کے خلوص اور حُسنِ کار نے اُن کے رفقا اور باشندگانِ سی۔پی میں مقصد کی تکمیل کے لیے جد و جہد کرنے اور مِل جل کر کام کرنے کا ایک معقول جذبہ اور ڈھنگ پیدا کر دیا ہے، ایک مختصر لیکن جامع تقریر میں نہایت دِل نشیں پیرایۂ بیان اور سُلجھے ہوئے انداز سے انجمنِ ترقی اُردو، اُردو اور اس کی ضرورت پر روشنی ڈالی۔اور صوبائی انجمن کی تشکیل کی اپیل کی۔یہ اپیل اتنی مؤثر اور پُر زور تھی کہ اس کے بعد کسی مزید گفتگو یا بحث کی گنجایش نہیں رہی۔چناں چہ باہمی مشورے اور رائے کے بعد صوبائی انجمن کی تشکیل عمل میں آئی اور اس کے بعد اُس کے عہدہ داران اور ارکان کا انتخاب بھی کر لیا گیا۔منظور شدہ تجاویز اور عہدہ داران کے نام حسبِ ذیل ہیں :-

(۱) طے پایا کہ صوبہ انجمن ترقی اُردو کی تشکیل کی جائے۔

(۲) طے پایا کہ انجمن کے عہدے حسبِ ذیل ہوں گے :-

(۱) صدر - ایک (۲) نائب صدر - چار (۳) سکریٹری - ایک
(۴) مددگار سکریٹری - دو (۵) خازن - ایک (۶) اراکین - چوبیس ۲۴

۳- کورم چھ ہو اور جن میں کم سے کم دو غیر عہدے دار شریک ہوں۔

۴- یہ انتخاب فی الحال ایک سال کے لیے ہو۔ دُوسرا انتخاب منظور شدہ قوانین و ضوابط کے مطابق ہوگا۔

عہدہ داروں کے نام یہ ہیں :-

(۱) صدر - جناب نواب صدیق علی خاں صاحب

(۲) سکریٹری - جناب عبدالسلام صاحب فاروقی

(۳) نائب صدر - محمد حامد صاحب ساقی بی - اے علیگ (سابق تحصیلدا
عبدالستار صاحب فاروقی - مدیر الفاروق کامٹی
مختار احمد صاحب وکیل - قاضی علاء الدین صاحب وکیل امراؤتی

(۴) خازن - مرزا مسعود بیگ صاحب -

(۵) دو مدد گار سکریٹری - عبدالسلام صاحب فاروقی منتخب کریں گے۔

(۶) اراکین - (۱) مولانا مفتی محمد برہان الحق صاحب جبل پور (۲) سید قاسم علی صاحب
رائے پور (۳) امین الرحمان صاحب بی - اے اکولہ (۴) خان صاحب
ظہور الحسن صاحب دُرگ (۵) بشیر الدین صاحب بے تول
(۶) عزیز احمد صاحب وکیل بالاگھاٹ (۷) حاجی سلیمان
صاحب ہوشنگ آباد (۸) شرف الدین صاحب وکیل امراؤتی
(۹) میاں محمد حسین صاحب ساگر (۱۰) عارف محمد خاں صاحب
چھندواڑہ (۱۱) ماسٹر محمد اسحٰق صاحب بلاس پور (۱۲) غلام دستگیر
صاحب منڈلہ (۱۳) ڈاکٹر خورشید احمد صاحب صدیقی کھنڈوا

(۱۴) غلام حسین صاحب وردھا (۱۵) ڈاکٹر عزیز احمد صاحب (ریاستوں کی طرف سے) (۱۶) حاجی عبد الغنی صاحب چاندہ (۱۷) عبدالوحید صاحب قریشی طرفہ بھنڈارہ (۱۸) ابراہیم علی خاں صاحب بلڈانہ (۱۹) عبدالرؤف صاحب ادن (ایوت محل) (۲۰) کیکا بھائی صاحب راج نانڈگانو (۲۱) فضل الکریم صاحب ناگ پور (۲۲) فیض انصاری صاحب ناگ پور (۲۳) عبدالستار صاحب صدیقی ناگ پور (۲۴) ظہیر وارثی صاحب کامٹی۔

یہ تمام امور اس خوب صورتی اور خوش اسلوبی سے انجام پائے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ہر شخص پیکرِ عمل بن گیا ہے اور خدمت کا صحیح جذبہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ اسی جلسے میں قواعد وضوابط کو مرتب کرنے کے لیے بھی ایک سب کمیٹی بنادی گئی جو حسب ذیل افراد پر مشتمل تھی :۔

(۱) نواب صدیق علی خاں صاحب (۲) حکیم اسرار احمد صاحب۔ (۳) مرزا اسمٰعیل بیگ صاحب (۴) فیض انصاری صاحب (۵) احمداللہ صاحب (۶) محمد حامد صاحب تحصیل دار۔

اور یہ طے پایا کہ کانفرنس کے ختم ہونے سے پہلے یہ سب کمیٹی اپنا کام پورا کرلے۔ اِس کے بعد تقریباً ۷ بجے شام کو جلسہ برخاست ہوا۔ دوسرے دن سب کمیٹی نے اپنا کام ختم کرلیا۔ اور قواعد وضوابط مرتب کرکے سکریٹری صاحب کو دے دیے جنھوں نے اُسے عام اطلاع کے لیے صوبے کے اخبارات میں شائع کرایا۔ اور نقل جملہ اراکین کے پاس بہ غرض منظوری بھیج دی۔

کانفرنس کا اِفتتاح

پہلی نشست

۹½ بجے شب

۱۹ر جنوری سنہ ۱۹۴۴ء کی رات کو ٹھیک ۹½ بجے ایک خوب صورت اور وسیع شامیانے میں جہاں قطار در قطار کُرسیاں لگی ہوئی تھیں اور سامنے ایک خوش نما ڈائس (شہ نشیں) بنا ہُوا تھا۔ شامیانے کا گوشہ گوشہ برقی قمقموں کی روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ ایک ممتاز مجمع کے سامنے اُردو کانفرنس کا اجلاس نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب شروانی کی صدارت میں شروع ہوا۔ حاضرین کی تعداد دس ہزار سے کسی طرح کم نہ تھی۔ شہ نشین پر اطرافِ ہند اور اضلاعِ صوبہ سے آئے ہوئے ممتاز حضرات تشریف فرما تھے۔ جناب نواب مرزا یار جنگ بہادر ایجنٹ برار حضورِ نظام خلد اللہ ملکہٗ نے کانفرنس کا افتتاح فرماتے ہوئے کہا "آج کی کانفرنس کا مقصد ہماری وطنی زبان اُردو کی ترقی و اشاعت ہے تاکہ ہندستان کو ایک عمومی زبان حاصل ہوجائے" موصوف نے اُردو کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ "اُردو زبان کی ترقی کا مقصد دوسری صوبائی اور مقامی زبانوں سے ٹکرانا نہیں ہے۔ دراصل یہ سوچ کر کہ اُردو زبان میں مُلک کی ایک زبان بننے کی صلاحیت موجود ہے اور اس کے سمجھنے اور بولنے والے ہر خطۂ مُلک میں پائے جاتے ہیں، اس کی ترقی کی سعی کی گئی۔ عثمانیہ یونی ورسٹی میں اعلاحضرت قدرِ قدرت میر عثمان علی خاں بہادر خلد اللہ ملکہٗ کے دورِ سعادت عہد میں اُردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دے کر تجربہ کیا گیا تو ابتداً بڑے شُبہات

کا اظہار کیا گیا۔ مگر بہت جلد یہ ثابت ہوگیا۔ کہ اُردو میں ایک علمی زبان بننے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ بڑے بڑے ماہرین تعلیم کی جنھوں نے عثمانیہ یونی ورسٹی کا بغور مطالعہ کیا ہے حوصلہ افزا رائیں آپ پڑھتے رہتے ہیں۔ ابھی حال میں سر رادھاکرشن نے جو بین الجامعاتی بورڈ کے صدر کی حیثیت سے حیدرآباد تشریف لائے تھے اِس کے متعلق بہت اچھی راے دی ہے۔ حیدرآباد میں جہاں دوسری بھی زبانیں پڑھائی جاتی ہیں اُردو کو اعلا تعلیم کا ذریعہ قرار دینے سے مقصد محض ایک عام زبان کی ترویج ہے۔ اِس کے سوا کچھ نہیں۔"

موصوف نے مولوی عبدالحق صاحب کی کوششوں کا ذکر کرنے کے بعد کانفرنس کی کام یابی کی توقع ظاہر کی۔ نواب محی الدین خاں صاحب ایم۔ ایل۔ اے نے اپنے مطبوعہ خطبے (جو اس رپوٹ میں شامل ہے) کے ذریعے نمایندگان اور مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔

پیغامات اس کے بعد خاک سار نے بہ حیثیت ناظم استقبالیہ کانفرنس کے متعلق ہم دردی اور دعاے کام یابی کے تار اور پیغامات جو آئے تھے اُن کو پڑھ کر سُنایا۔ چوں کہ تار اور پیغامات کی تعداد بہت زیادہ تھی اس لیے تھوڑے سے پیغامات سُنانے کے بعد پھر پیغام بھیجنے والوں کے نام سُنانے پر اکتفا کیا گیا۔ حسب ذیل حضرات کی جانب سے پیغامات موصول ہوئے :۔

۱۔ آنریبل ملک سر فیروز خان نون کے۔ سی۔ ایس۔ آئی، کے۔ سی۔ آئی۔ ای ڈفنس ممبر گورنمنٹ آف انڈیا۔

۲۔ نواب کرنل حافظ سر احمد سعید خاں صاحب آف چھتاری صدرِ اعظم حکومت آصفیہ دکن۔

۳۔ پرو وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

۴ - سر مرزا محمّد اسماعیل کے ۔ سی ۔ آئی ۔ ای ۔ او ۔ بی ۔ ای وزیر اعظم ریاست جے پور

۵ - سر لیاقت علی صاحب بھوپال ۔

۶ - نواب علی یاور جنگ بہادر معتمد امورِ عامہ حکومتِ آصفیہ ۔

۷ - آنریبل غلام محمد صاحب صدر المہام فنانس حکومتِ آصفیہ ۔

۸ - ڈاکٹر سر ضیاء الدین صاحب وائس چانسلر مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ ۔

۹ - ناگری پرچارنی سبھا بنارس ۔

۱۰ - نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام سیاسیات و تعلیمات حکومتِ آصفیہ حیدر آباد دکن ۔

۱۱ - پروفیسر حامد حسن قادری صاحب سینٹ جانسن کالج آگرہ ۔

۱۲ - پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب ۔ مہاراجا کالج میسور

۱۳ - نواب ناظر یار جنگ بہادر سابق جج عدالتِ عالیہ حیدر آباد ۔

۱۴ - بزمِ ادب رائے گڑھ

۱۵ - حمید احمد خاں صاحب لاہور ۔

۱۶ - وائس چانسلر آگرہ یونی ورسٹی آگرہ ۔

۱۷ - خان بہادر بشیر حسین زیدی صاحب چیف منسٹر ریاست رام پور ۔

۱۸ - پروفیسر محمد طاہر فاروقی صاحب آگرہ کالج آگرہ ۔

۱۹ - مولوی عبدالباری معنی صاحب اجمیر ۔

۲۰ - جناب شاہ عالم خاں صاحب ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم صوبہ سرحد ۔

۲۱ - میاں بشیر احمد صاحب بار ایٹ لا ایڈیٹر 'ہمایوں' لاہور ۔

۲۲ - پروفیسر سیّد عبداللہ صاحب اورینٹل کالج لاہور ۔

۲۳ - ڈاکٹر سیّد نجم الدین جعفری صاحب الہ آباد

۲۴۔ رام بابو سکسینہ صاحب کلکٹر بریلی۔

۲۵۔ عزیز احمد صاحب بریلی۔

۲۶۔ سر ایس رادھا کرشنان صاحب وائس چانسلر ہندو یونی ورسٹی بنارس۔

۲۷۔ مولانا غلام رسول مہر ایڈیٹر "انقلاب" لاہور۔

۲۸۔ سر عبدالقادر صاحب چیف جسٹس عدالتِ عالیہ بہاول پور۔

۲۹۔ جناب مولوی امام الاسلام صاحب نقشبندی بالاپور (برار)

۳۰۔ سکرٹری صاحب انجمنِ ترقیٔ اردو ترچناپلی۔

۳۱۔ جناب سید تفضل کریم حسینی صاحب جمشید پور۔

۳۲۔ جناب جعفر امام صاحب پٹنہ

۳۳۔ نواب محمد اسماعیل صاحب پٹنہ۔

۳۴۔ جناب محمد شریف صاحب بیرسٹر پٹنہ۔

۳۵۔ جناب ہادی نقشبندی صاحب بالاپور (برار)

خطبۂ استقبالیہ

اس کے بعد خطبۂ صدرِ استقبالیہ ہوا۔ چوں کہ نواب محی الدین خاں صاحب صدرِ استقبالیہ کی طبیعت کچھ ناساز تھی اس لیے جناب خیر بھوروی نمایندۂ خصوصی کُل ہند انجمن ترقیٔ اُردو دہلی نے صاحب موصوف کی طرف سے خطبۂ استقبالیہ جو مطبوعہ صورت میں تھا، پڑھا۔ بعد میں یہ خطبہ تقسیم کیا گیا۔ یہ خطبہ اپنے مضمون اور عنوان کے لحاظ سے نہایت ہی برمحل، پُر لطف، سنجیدہ اور ہدایت آفریں تھا۔ حاضرین نے پوری توجہ اور دل چسپی سے سُنا۔ خطبۂ استقبالیہ درج ذیل ہے:۔

بزرگوں سے یہ رسم چلی آتی ہے کہ ہر کانفرنس و اجلاس کے موقع پر مہمانوں کا

شکریہ اور کارکنوں کی خدمت کے اعتراف و احسان مندی سے پہلے شہر کی تاریخی حالت اور اس کی اہمیت پر مختصر سا تبصرہ کیا جائے ۔ گزشتہ تاریخ اور اسلاف کے کارنامے دہرانے سے جہاں ایک مطلب یہ ہوتا ہے کہ مہمانوں اور باہر سے آنے والوں پر اپنی ملکی و قومی خدمات اور شہر کی تاریخی و جغرافیائی اہمیت کا سکہ بٹھلاکر ان کو مرعوب کیا جائے ۔ وہیں اس کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ پچھلی زندگی کا نقشہ کھینچ کر اور اپنے بزرگوں کے عظیم الشان کارناموں کا ذکر کر کے اپنے ارادوں میں پختگی، قوم میں جوشِ عمل اور تجاویز میں قوت پیدا کی جائے اور یہ یقین دلایا جائے کہ ہم بھی اپنے پیش رووں کی طرح اس کام کو انجام تک پہنچانے میں ہر طرح کی سعی و کوشش صرف کریں گے ـــــ لیکن میرے لیے تو یہ سخت مشکل مسئلہ ہے۔ ناگ پور نہ تو اپنے پسِ پشت کوئی تاریخی منظر رکھتا ہے نہ اس کو دلی و آگرہ کی طرح شان دار عمارتوں اور قابلِ ذکر بادشاہوں کی راج دھانی ہونے کا فخر رہا ہے نہ یہاں اجنٹا کے ہوش رُبا غار ہیں نہ ساحلِ بمبئی کے خوش نما نظارے ، نہ لکھنؤ کی تہذیب ہے نہ پنجاب کی زندہ دلی ،ـــ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اِس خطّے کی تمام رنگینیاں اور شادابیاں اور اس سرزمین کی ساری لطافت و نزاکت سنترے میں (نہیں جہاں گیر کی زبان میں اس کو رنگ ترہ کہتے ہیں) سمٹ کر جمع ہوگئی ہے سنترے کا نام ناگ پور سے روشن ہے تو ناگ پور کو سنترے نے شہرتِ دوام بخشی ہے ـــ لیکن ٹھیریے میں غلطی کر رہا ہوں ۔ شاید آپ بھولے نہ ہوں کہ ۱۹۳۶ء میں اسی شہر کے اندر بھارتیہ ساہتیہ پریشد کا ایک اجلاس ہوا تھا جس کی صدارت ہندستان کے مشہور و معروف رہنما گاندھی جی نے فرمائی تھی ، جس میں ہندی اتھوا ہندستانی کا مسئلہ اُٹھایا گیا تھا ۔ اس میں ہمارے محترم بزرگ مولانا عبدالحق صاحب ارادتاً نہیں اتفاقاً آ گئے تھے ۔ اس پر حضرت مولانا نے " بھارتیہ ساہتیہ پریشد ناگ پور کی حقیقت "

کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا ـــــــ یہ پہلا موقع تھا کہ ناگ پور کا نام ایک نئے عنوان سے اخبارات میں آیا۔ اس کو کچھ زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ ودّیامندر اسکیم کے ساتھ پھر یادش بخیر ناگ پور کا نام آنے لگا۔ اس طرح ناگ پور نے وہ تاریخی عظمت حاصل کرلی اور علمی و ادبی مجلسوں میں اس کا اتنی بار ذکرِ خیر ہوا کہ سنترے کو بھول کر لوگوں نے بھارتیہ ساہتیہ پریشد والا ناگ پور اور ودّیامندر اسکیم والا ناگ پور کہنا شروع کردیا۔ اس طرح ناگ پور نے سنترے والی کاروباری دُنیا سے نکل کر علم و ادب کی نئی دنیا میں اپنے لیے ایک نمایاں جگہ اور تاریخ میں ایک ممتاز جگہ حاصل کرلی ایسی ممتاز حیثیت کہ جس نے تاریخ لکھنے اور لکھانے والی انجمنِ ترقّیٔ اُردو کی تاریخ بدل دی اور اورنگ آباد کی محدود دُنیا سے نکال کر دلّی کی راج دھانی میں لاکر اُسے علم و ادب کی خدمت کا تاج پہنا دیا۔ خیر یہ تو ایک سخن گسترانہ بات تھی جو اپنی اور اپنی سرزمین کی لاج رکھنے کے لیے عرض کردی گئی۔

حضرات! میں اس لیے کھڑا ہوا ہوں کہ اپنے معزز مہمانوں اپنے بزرگ کرم فرماؤں اور اپنے عزیز دوستوں کا شکریہ ادا کروں کہ آپ حضرات نے ہماری دعوت کو شرفِ قبولیت عطا فرمایا اور دور دراز مقامات سے سفر کی دقّتوں اور راستے کی زحمتوں کو گوارا فرماکر کانفرنس کو رونق بخشی اور ہمیں امید ہے کہ آپ کے علم، تجربے اور مفید مشوروں کی رہ نمائی میں ہم اُردو کی خدمت اور اس کی ترقّی کے لیے ایسی راہیں نکال سکیں گے اور وہ صورتیں اختیار کرسکیں گے جن پر چل کر اور جنھیں اختیار کرکے ہم کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام کرسکیں۔

حضرات! میں یہاں یہ بات بھی صاف کردینا چاہتا ہوں کہ اُردو کی خدمت کسی انتقامی جذبے یا کسی فرقہ وارانہ اسپرٹ کے ماتحت نہیں، نہ اسے ہم ہندی کے مقابلے میں لاکر کوئی محاذِ جنگ بنانا چاہتے ہیں۔ یہ تو ہم ہندستانیوں کی

شامتِ اعمال اور ہندستان کی بدقسمتی ہو جو یہاں ہر مسئلہ " ہندو مسلمان پانی "
کی طرح ہندو اور مسلمان کی رسّاکشی کا ایک ذریعہ بن جاتا ہو ورنہ اُردو کی خدمت
تو درحقیقت مُلک اور مُلک میں رہنے والوں کی خدمت اور بھلائی کا دوسرا نام
ہو! آپ غور تو کیجیے اور سمجھنے کے لیے ہندستان کو ایک گھر فرض کرکے سوچیے
تو سہی کہ اس گھر کے رہنے والے اگر الگ الگ بولی بولنے لگیں جس کا لازمی
نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک کی بات دوسرا نہیں سمجھے گا تو اس گھر کے رہنے والوں کا
کیا حشر ہوگا! اور وہ کس طرح ایک ساتھ رہ سکیں گے!

ہم سے کہا جاتا ہو کہ ایسے زمانے میں جب کہ جنگ کی تیز و تند ہوائیں
چل رہی ہیں، گرانی نے جینا دُشوار کردیا ہو اور ہر طرف نفسی نفسی کی پُکار پڑی
ہو، انجمن ترقیِ اُردو (ہند) کی طرف سے کانفرنس کا انعقاد کیا معنی رکھتا ہو؟
دوستو! آپ کا یہ کہنا سر آنکھوں پر لیکن یہ تصویر کا ایک رُخ ہو اور وہ رُخ جو
غلامانہ ذہنیت کا حامل ہو۔ زندہ قومیں تو خاک و خون کی اسی آب و گِل سے
اپنی نئی دُنیا تعمیر کرتی ہیں اور آج بھی یہی ہو رہا ہو۔ تلوار کی آب بھٹی میں تپنے
کی رہینِ منت ہو تو اس کے جوہر میدانِ جنگ کے محتاج، کم زور طبیعت
اور شکّی مزاج لوگ ہی زمانے کی سازگاری و حالات کی موافقت کا انتظار کرتے
ہیں اور اکثر انتظار ہی کرتے رہتے ہیں کیوں کہ زمانہ کبھی اُن کے لیے سازگار
نہیں ہوتا اور حالات کبھی ان کے موافق نہیں آتے۔ کام کرنے والے اور
عزم و ارادے والے تو بہ قول علامہ اقبالؒ ع زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز
پہاڑوں کو کاٹ کر اپنے لیے راستہ نکالتے ہیں اور زمانہ موافق نہ ہو تو اس کو
موافق بنالیتے ہیں ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہو

اس مطلع اور مقطع کے بعد اب آیے دو چار کام کی باتیں بھی کرلیں جس کی خاطر ہم یہاں جمع ہوے ہیں اور جس کے لیے اتنی منزلیں طے کرکے آپ نے اس کانفرنس میں شرکت کی زحمت اُٹھائی ہی۔

سب سے پہلی اور سب سے اہم بات تو یہ ہی کہ آپ اس مخمصے سے بے نیاز ہوکر کہ کون کیا کہتا ہی اپنے فرض کو محسوس کیجیے اور اس کی تکمیل کے لیے کمرِ ہمت باندھ لیجیے۔ جو اُردوٗ کی ضرؤرت اور اہمیت کو محسوس نہیں کرتا اس کو جانے دیجیے سوال یہ ہی کہ آپ اس کی ضرؤرت و اہمیت کے قائل ہیں یا نہیں؟ اگر خود آپ کو اس کا اعتراف ہی تو اس کی خدمت میں لگ جایئے اور جو آپ کا ساتھ دینا چاہے اس سے پؤرا پؤرا تعاون و اشتراک کیجیے کام کرنے کا طریقہ بس یہی ہی۔ شکوہ شکایت بے کاروں کا کام ہی اور دؤسروں کا سہارا ڈھونڈھنا حیلہ جوئی کا دؤسرا نام۔ اپنا کام خود ہی خوب ہوتا ہی۔

کام کا دؤسرا قدم مرکزیت کا قیام اور نظم و ضبط کے ساتھ مسلسل خدمت کرنے کی لگن ہی۔ اگر ہم کو اُردوٗ کی خدمت کرنی ہی تو کُل ہند انجمنِ ترقیٔ اُردوٗ کی زیرِ نگرانی ہمیں صؤبے کے ایک ایک ضلع اور ایک ایک قریے میں اس کی شاخیں قائم کرنی چاہییں اور ڈھونڈ کر وہاں ایسے کارکن مہیّا کرنے چاہییں جن کو واقعی اُردوٗ سے محبّت اور اس کی خدمت کا جذبہ ہو۔ خالی نعرے لگانے اور محض زندہ باد کہہ دینے سے کام نہیں چل سکتا۔

ہمارا تیسرا قدم معاملہ فہمی کا ثبوت دینا ہی۔ یعنی زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دینا، دُنیا نے جو ترقّی کے قدم اُٹھائے ہیں زبان کو اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھانا اور بے جا مرعوبیت اور ناجائز قدامت پرستی کا قلع قمع اس میں سبھی کچھ آجاتا ہی۔ ایک متروکات ہی کو لے لیجیے۔ زمانہ تو یہ ہی کہ زندہ زبانیں

دوسری زبانوں کے الفاظ، محاورے، اندازِ بیان اور ہر وہ چیز لے رہی ہے جن سے ان میں وسعت پیدا ہو، ادائے مطالب میں آسانی ہو لیکن ہم ہیں کہ ہم نے اپنی زبان کے اچھے خاصے الفاظ کو نکال رکھا ہے ضرورت ہے کہ ان پر نظرِ ثانی کی جائے اور اِس جلاوطنی کے سلسلے کو ختم کیا جائے۔

اُردو زبان کی ترقی کی راہ میں رسمِ خط کا مسئلہ بھی ایک اہم اور بنیادی مسئلہ ہے۔ اس کانفرنس میں یہ چیز آرہی ہے اور مجھے اپنے بزرگ اور کرم فرما مولانا عبدالحق صاحب سے امید ہے کہ وہ اس فیصلے میں کسی قسم کی رُو رعایت سے کام نہیں لیں گے بلکہ ایسا بے لاگ فیصلہ کریں گے کہ جس سے اُردو کی تعلیم اور طباعت کا مسئلہ حل ہو سکے۔

آخر میں مَیں پھر آپ تمام حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ایک طرف تو ناگ پور کے وہ بزرگ اور رفقائے کار ہیں جن کی امداد و اعانت نے اس کانفرنس کو زندگی اور وجود بخشا اس میں وہ سخی داتا بھی ہیں جنھوں نے پیسے سے ہماری امداد فرمائی، وہ رضاکار بھی ہیں جنھوں نے محنت اور وقت کی قربانی کی اور وہ کارکن بھی ہیں جنھوں نے لکھا پڑھی اور دوڑ دھوپ کے ذریعے مختلف قوتوں کو یک جا کر کے نظم و ضبط کے ساتھ ایسی شیرازہ بندی کی۔ جو آج اس صورت میں جلوہ گر ہے ـــــ مَیں ان تمام حضرات کا تہِ دل سے شکرگزار ہوں اور معترف ہوں کہ ان کی امداد و اعانت کے بغیر مَیں اپنے فرائض کسی طرح انجام نہیں دے سکتا تھا۔

دوسری طرف ہمارے معزز مہمان ہیں جن کی تشریف آوری اور شرکت نے فخر و مسرت کے جذبے کے ماتحت ہمارے سرِ نیاز کو اونچا کر دیا ہے اور "اُردو" کو یہ کہنے کا موقع دیا ہے کہ ہر طبقے و خیال میں

اس کے دل دادہ اور گرویدہ موجود ہیں اور اس کی خاطر ہر طرح کی قربانی و ایثار کے لیے آمادہ و تیار ہیں۔ مَیں ان تمام گرامی حضرات کی خدمت میں ہدیۂ تشکر و امتنان پیش کرتا ہوں جو اپنے ضروری مشاغل اور اپنی راحت و آسایش ترک کرکے اُردو کی خدمت اور اس کی ترقّی کی لگن میں یہاں ایسی سردی اور ایسے نازک زمانے میں جمع ہوئے ہیں اور ہماری دعوت کو قبول فرماکر ہم کو سرافرازی اور انبساط کا موقع دیا ہے اور بارگاہِ رب العزت میں دعا ہے کہ وہ ہم سب کو مِل جُل کر کام کرنے اور ہندُستان کی اس مشترکہ زبان کو ترقّی دینے کی توفیق عطا کرے اور ہم سے باہمی بغض و عداوت اور طبقے دارانہ اور فرقے دارانہ تعصب و نفرت دُور رکھے اور ہم سب بھائی بھائی کی طرح ایک دُوسرے کی راحت و آسایش اور فائدے اور بھلائی کا خیال کرنے لگیں۔

بزرگو اور دوستو! اب مَیں آپ سے اس سمع خراشی کی معذرت چاہتا ہوں اور اس امید کے ساتھ رخصت ہوتا ہوں کہ پھر جب کبھی ہمیں ملنے کا اتفاق ہوگا تو ہم اس حالت میں ملیں گے کہ ہم ایک دوسرے کو اس کے جوشِ عمل اور حُسنِ خدمت پر مبارک باد دے سکیں! بھائیو دُنیا دار العمل ہے اس میں وہی سُرخ رُو اور کام یاب ہوتا ہے جو زندگی کا ثبوت دے سکے اور اپنا حق دنیا سے منوا سکے ؎

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کے خود اُٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

خطبۂ صدارت

پھر تحریک و تائید صدارت کی رسم کے بعد نواب صدر یار جنگ مولانا

حبیب الرحمان صاحب شروانی نے خطبۂ صدارت پڑھا۔ یہ خطبہ نہایت ہی شان دار و عالمانہ تھا۔ زبان و ادب کی چاشنی کے ساتھ ساتھ حقائق و معارف کو بھی پہلو بہ پہلو رکھا گیا تھا۔ فاضل صدر نے انجمنِ ترقیٔ اُردو کی ساری تاریخ اس مختصر سے خطبے میں سمو دی تھی۔ پھر ماضی کی داستان کے ساتھ حال کے آئینے میں مستقبل کی جھلک بھی صاف نظر آرہی تھی۔ خطبۂ صدارت درجِ ذیل ہی:۔

حضرات! آپ نے مجھے اس ادبی و علمی مجلس کی صدارت کا جو اعزاز عطا فرمایا ہی اس کے لیے مَیں دِل سے آپ کا سپاس گزار ہوں، مجھ کو آغازِ کار سے اب تک انجمنِ ترقیٔ اُردو سے دِل چسپی رہی ہی اور مَیں نے اس کی خدمات انجام دینے کی کوشش کی ہی۔

انجمنِ ترقیٔ اُردو کس طرح وجود میں آئی؟ اس موقع پر اس کا مختصر تذکرہ غالباً بے موقع نہ ہوگا۔ چالیس برس سے بھی زیادہ زمانہ گزرا کہ ۱۹۰۳ء میں ملکِ معظّم کی تاج پوشی کے سلسلے میں ایک شان دار تاریخی دربار دہلی میں منعقد ہوا۔ علی گڑھ کے اربابِ حل و عقد خصوصاً صاحب زادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے جو کانفرنس کے آنریری جائنٹ سکریٹری تھے یہ مناسب سمجھا کہ اس تاریخی موقع پر آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس بھی دہلی میں منعقد کیا جائے، چناں چہ کانفرنس کا سولھواں اجلاس زیرِ صدارت ہز ہائی نس سر آغا خاں بہ الغایہ نہایت شان و شوکت سے دہلی میں منعقد ہوا، جس میں ہندستان اور انگلستان کے بہت سے مشہور و نام ور اصحاب اور بعض والیانِ ملک و ارکانِ حکومت نے شرکت فرمائی، اسی تاریخی اجلاس میں ایک رزولیوشن کی بِنا پر کانفرنس کا ایک لٹریری سکشن یا شعبۂ ترقیٔ اُردو قائم ہوا، اور اس شعبے کے معتمدِ اعزازی (آنریری سکریٹری) شمس العلما مولانا شبلی نعمانی مقرر ہوئے، یہ تھا آپ کی انجمن کا

مبارک آغاز۔ یہ بھی ایک عجیب حُسنِ اتفاق ہے کہ شعبۂ ترقیٔ اُردو کا سنگِ بنیاد دہلی میں رکھا گیا جو اُردو کا مولد و مرکز مانا گیا ہے دوسرا حُسنِ اتفاق یہ ہے کہ یہ انجمن کم و بیش ایک تہائی صدی کے بعد اپنے دورِ عروج و شباب میں بہت سے کارنامے انجام دینے اور خسروِ دکن خلّد اللہ ملکہٗ کے الطافِ شاہانہ سے بہرہ اندوز ہونے کے بعد پھر اُسی دہلی میں آگئی جہاں اس صدی کے آغاز میں اسے حیاتِ اوّلیں حاصل ہوئی تھی۔

حضرات! شعبۂ ترقیٔ اُردو نے وجود میں آنے کے بعد باوجود ناسازگار حالات کے کچھ نہ کچھ کام شروع کردیا تھا اور ایجوکیشنل کانفرنس بہ قدرِ گنجایش اس شعبے کی مالی امداد کر رہی تھی کہ شعبے کے معتمدِ اعزازی مولانا شبلی نعمانی نے ۱۹۰۵ء تک کام کرنے کے بعد کثرتِ مشاغل کی وجہ سے استعفا دے دیا اور یہ خدمت کانفرنس کی طرف سے میرے سپرد کی گئی، اس کے بعد مولوی عزیز مرزا صاحب مرحوم نے اس کام کو سنبھالا، مگر ان کی افسوس ناک وفات نے ساری امیدوں کا جو ان کی ذات سے وابستہ تھیں، خاتمہ کردیا۔

آخر کار ۱۹۱۲ء میں قرعۂ فال مولوی عبدالحق صاحب کے نام نکلا جو آپ کی انجمن کے چوتھے معتمدِ اعزازی ہیں، انھوں نے اس شعبے کو ہاتھ میں لے کر بہ تدریج ایسے مرتبے پر پہنچایا کہ چار دانگِ ہند میں اُسے شہرت حاصل ہوگئی اور وہ ایجوکیشنل کانفرنس کی مالی سرپرستی سے بے نیاز ہوکر ہندُستان کا ایک مشہور و مستقل ادارہ بن گئی۔

حضرات! ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے اپنی محنت و کوشش سے انجمنِ ترقیٔ اُردو کو جس درجے تک پہنچایا اس کا مجھے ابتدا ہی سے اعتراف ہے دسمبر ۱۹۲۵ء میں ایم۔اے۔او کالج کی پنجاہ سالہ جوبلی کے موقع پر آل انڈیا

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا جو اجلاس علی گڑھ میں منعقد ہوا، مَیں نے بحیثیت آنریری سکریٹری ایجوکیشنل کانفرنس اس اجلاس میں جو رپوٹ پڑھی اس میں یہ عرض کیا تھا:-

" انجمن کی موجودہ ترقی و کام یابی نتیجہ ہے مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے کی سعی وہمت کا جو بڑے مستقل مزاج، پختہ کار اور مسلسل کام کرنے والے شخص ہیں اور عملاً انھوں نے اپنی زندگی اُردو کی خدمت کے لیے وقف کردی ہے جس میں وہ خاموشی کے ساتھ سال ہا سال سے مصروف ہیں۔"

اس کے بعد ۱۹۳۶ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی پنجاہ سالہ جوبلی کے موقع پر بھی مَیں نے اپنی رپوٹ میں کانفرنس کی "تاریخِ ماضی" کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ "کس طرح کانفرنس کے شعبۂ ترقیِ اُردو نے ترقی کرکے موجودہ " انجمنِ ترقیِ اُردو " کی صورت اختیار کی جو آج ایک مستقل انجمن کی حیثیت سے اپنے معتمد و قابل سکریٹری مولوی عبدالحق صاحب کے زیرِ نگرانی علم و ادب کی ترقی میں مصروف ہے۔"

حضرات! یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ باوجود ملک میں جدید تعلیم پھیل جانے کے ہمیں ایسے لائق و بلند ہمت کارکن میسّر نہیں آتے جو ہمارے قومی اداروں کو صحیح طریقے پر خوش اسلوبی سے چلاکر ملک و قوم کے لیے مفید و سودمند بناسکیں، اِن حالات میں یقیناً یہ انجمن کی خوش نصیبی ہے کہ اُسے ایک ایسا معتمد (سکریٹری) میسّر آگیا جو بغیر کسی معاوضے یا صلے کی توقع کے محض اپنے ذاتی ذوق و شوق سے ہماری زبان کی خدمت میں مصروف ہے۔ ایسی کارپرداز ہستی کی خدمات کا اعتراف ہمارا اخلاقی فرض ہے۔

حضرات! آج اُردو کانفرنس کے اجلاسِ ناگ پور میں زندگی کے جو آثار مجھے نظر آرہے ہیں مَیں اس پر اظہارِ مسرّت کیے بغیر نہیں رہ سکتا، کیا

بعید ہی کہ یہ اجلاس انجمن کے لیے ایک جدید دورِ ترقی کے آغاز کا باعث ہو۔ یہ حُسنِ ظن اس لیے ہی کہ اب سے پہلے بھی ناگ پور کا ایک قومی اجتماع مسلمانانِ ہند کی تعلیمی زندگی میں ایک جدید دور اور مبارک انقلاب کا باعث ہوا تھا۔

یہ اجتماع جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہی آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس تھا جو ۱۹۱۰ء میں ناگ پور میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں مسلم یونی ورسٹی کے قیام کے متعلق ایک رزولیوشن منظور ہوا، اور اجلاس کے فوراً بعد اس تحریک کے متعلق عملی جدّ و جہد شروع ہوگئی جو آخرکار کام یاب ہوکر مسلم یونی ورسٹی کی صورت میں نمایاں ہوئی۔

مسلم یونی ورسٹی کے قیام کی تحریک سرسید کی رحلت کے بعد ہی ملک کے سامنے آگئی تھی اور کانفرنس کے اجلاس میں سال بہ سال اس کے متعلق رزولیوشن پاس ہوتا اور پُرزور تقریریں کی جاتی تھیں، لیکن یہ سعادت ناگ پور ہی کے لیے مقدر تھی کہ یہاں جو رزولیوشن ۱۹۱۰ء میں منظور ہوا۔ جنوری ۱۹۱۱ء سے نہایت سرگرمی سے اس کی تعمیل شروع ہوگئی۔ اس اجلاس میں ہزہائی نس سر آغاخاں خاص اسی مقصد سے تشریف لائے تھے کہ مسلم یونی ورسٹی کے لیے عملی جدوجہد کا آغاز کریں۔

یہ واقعہ جو بہ ظاہر کسی قدر غیر متعلق ہی اس لیے عرض کیا گیا کہ ناگ پور کا یہ "کارنامہ" ہمارے دلوں میں تازہ ہوجائے کہ اب سے پہلے بھی یہاں کا ایک اجتماع ہماری حیاتِ قومی کے لیے نتیجہ خیز و بارآور ثابت ہوچکا ہی۔ یہ امر باعثِ صد مسرت ہی کہ اگرچہ سی پی میں اہلِ اردو کی آبادی نہایت قلیل ہی اور ان کی اقتصادی حالت بھی لائقِ اطمینان نہیں، لیکن اس پر بھی وہ اپنی مستقل ہستی قائم رکھنے کے لیے بڑے بڑے کاموں کو اولوالعزمی سے انجام

دیتے ہیں جس کا ایک زبردست ثبوت یہ اُردو کانفرنس ہی جو نہایت شان و شوکت سے منعقد ہورہی ہی۔

حضرات! صوبۂ متوسط و برار کے اربابِ ادب نے ناگ پور میں اُردو کانفرنس کو دعوتِ تازہ دے کر درحقیقت اپنی علمی و ادبی خدمت کا ثبوت دیا ہی۔ ملکی و مادری زبان کی حفاظت اور ترقی کے لیے کوشش کرنا ہر محبِّ وطن اور بلند نظر ہندستانی کا اوّلین فرض ہی اس لیے کوئی شخص اُردو ادب کی خدمت والوں کو اس پر ملامت نہیں کرسکتا کہ وہ اُردو زبان کے تحفظ و ترقی کے لیے کوشش کر رہے ہیں۔ اُردو کو کسی قسم کی مذہبی عظمت حاصل نہیں ہی اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اُردو کی جو حمایت کی جارہی ہی اس میں کوئی مذہبی جذبہ کارفرما ہی، البتہ اُردو کو ایک خاص تاریخی عظمت ضرور حاصل ہی یعنی وہ اس عہدِ زریں کی یادگار ہی جب اس مُلک کی پُر امن فضا میں ہندو مسلمان برادرانہ محبت کے ساتھ علم و ادب کی خدمت میں مصروف تھے اور اُردو ہندی کا مسئلہ جو زمانۂ حاضرہ کی زہریلی سیاست کی پیداوار ہی، مُلک میں موجود نہ تھا۔ یہی زبان جسے اب ہم "اُردو" کہتے ہیں "ہندی" کے نام سے موسوم تھی یعنی وہ اہلِ ہند کی "مشترک ملکی زبان" سمجھی جاتی خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان!

مغربی تعلیم کے اثرات نے ہماری مُلکی و قومی خصوصیتوں کو ایک ایک کرکے فنا کردیا ہی یہاں تک کہ ہم اپنی ہستی کو بھی بھول گئے۔ اب اگر اس شان دار ماضی کی کوئی زندہ یادگار اس مُلک میں باقی رہ گئی ہی تو وہ یہی زبان ہی جسے ہندو مسلمان دونوں بولتے ہیں اور کسی زمانے میں انگریز بھی اس کے سیکھنے اور سمجھنے بلکہ ترقی دینے کی کوشش کرتے تھے۔

حضرات! اُردُو کی ابتدائی تاریخ، تدریجی ترقّی اور نشوونما کے متعلّق کافی بحث ہو چکی ہو جس کے اعادے کی یہاں ضرورت نہیں، لیکن اس قدر عرض کرنا بے موقع نہ ہوگا کہ جس شخص نے بھی اُردُو زبان کی "تاریخِ ماضی" کا مطالعہ کیا ہو وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں رہ سکتا کہ اُردُو کسی زمانے میں بھی کسی کی مخصوص زبان نہ تھی یہی وجہ ہو کہ ہماری اَدَبی صحبتوں اور مشاعروں میں ہندُو مسلمان یکساں ذوق و شوق سے شریک ہوتے تھے بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ جن اسباب نے ہندو مسلمانوں کے باہمی تعلقات کو نہ صرف خوش گوار بلکہ مستحکم و استوار بنا دیا تھا ان میں اُردُو اَدَب بھی تھا۔ ان اَدَبی صحبتوں میں شریک ہوکر ہندُو مسلمان دونوں یہ بھول جاتے تھے کہ وہ کون ہیں، مشترک ذوق نے دونوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کردیا تھا۔ جس کا اخلاقی اثر ہماری ساری زندگی پر پڑتا تھا۔ اگر ہندُو مسلمان رواداری سے کام لیں تو آج بھی وہ زمانہ واپس آسکتا ہو۔

حضرات! جب ۱۹۳۶ء میں انجمنِ ترقّیٔ اُردُو کی ایک کانفرنس کا اجلاس علی گڑھ میں منعقد ہوا تو میں نے اس موقع پر بھی اُردُو زبان کی اس حیثیت کو واضح کیا تھا کہ "وہ ہندُو مسلمانوں کا ایک مشترک سرمایہ ہو"۔ نامناسب نہ ہوگا اگر ان خیالات کا اس موقع پر اِعادہ کیا جائے۔

میں نے یہ عرض کیا تھا کہ "ہندُستان میں مشترک قومی زبان کی اہمیت یوں اور مسلّم ہو کہ ہماری تمدّنی زندگی میں دوسرے مشترک عناصر کی کمی ہو۔ خوش قسمتی سے زبان کے معاملے میں ہمارے قوم کے دونوں اہم حصّوں یعنی ہندُو مسلمانوں نے صدیوں کے تعاون سے ایک زبان اور ایک اَدَب کی پرورش کی ہو جو ہر چند ابھی نوخیز ہو تاہم اپنے امکاناتِ ترقّی کے اعتبار سے کسی سے پیچھے نہیں ہو اور یہ بات اس لیے اور زیادہ اہم ہو کہ اس کے صالح اثرات سے

دوسری کمیوں کی تلافی کی امید کی جاسکتی ہی، زبان کے الفاظ کا سرمایہ قوم کی ذہنی کیفیات اور تصوّرات کا خزانہ ہوتا ہی اس خزانے کے مشترک ہونے سے قوم کے رجحانات اور اُن کے عزائم میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہوتی ہی اس لیے اس مشترک تمدّنی قوّت کو ترقّی دینا ہر سچّے ہندستانی کا فرض ہونا چاہیے اور وہ کوشش جو اِس مشترک قومی سرمایے کو منتشر کرنا یا غیر موثر بنانا چاہے اس کا سدِّ باب قومی فرض ہی۔

ہماری بدنصیبی ہی کہ لوگ اس مشترک قومی سرمایے کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ مجھے یقین ہی کہ آپ حضرات جو ملک کے نمایندے ہیں باہمی سمجھوتے سے ایسی تدابیر اختیار کریں گے جس سے تنگ نظری اور فرقہ پروری کا سدِّ باب ہوجائے گا اور ہمارا یہ سرمایۂ قومی بربادی سے محفوظ رہ جائے گا۔ یہی نہیں بلکہ ہمارا یہ مقصد بھی ہونا چاہیے کہ اس کے مفید اثرات کو تعلیم یافتہ لوگوں کے محدود حلقے سے نکال کر قوم کے ہر چھوٹے بڑے کو اس سے فیض یاب ہونے کا موقع دیں۔

حضرات! مذکورہ بالا وجوہ کی بنا پر ملک میں ایک ایسی انجمن یا مستقل ادارے کا قیام ناگزیر تھا جو نہ صرف ہماری ملکی و مادری زبان کے تحفّظ کی خدمت انجام دے بلکہ اس کی ترقّی اور حلقۂ اثر کو وسعت دینے کے لیے بھی زبردست وسائل اختیار کرے اسی کے ساتھ یہ کوشش بھی کرے کہ اُردو کو ہندستان میں وہ درجہ حاصل ہوجائے جس کی وہ بجا طور پر مستحق ہی۔

یہ امر باعثِ مسرّت ہی کہ انجمن ترقّیٔ اُردو اس خدمت کو انجام دینے کی کوشش میں سرگرم ہی۔ اس لیے ہم سب کا یہ فرض ہی کہ اپنی مالی و اخلاقی امداد سے اس اِدارے کی بنیادیں اس قدر مستحکم و استوار کردیں کہ وہ

زیادہ جرأت و حوصلہ مندی سے ہماری زبان کی خدمت انجام دے سکے، اگرچہ اب تک مختلف طریقوں سے انجمن نے اُردو کی بہت کچھ خدمت کی ہے، اور علمی و ادبی تالیفات و تراجم کے ذریعے سے ہماری زبان کے ذخیرۂ علم و ادب میں گراں بہا اضافہ کیا ہے لیکن ابھی بہت کچھ کام، کرنے کے لیے باقی ہے جو بہر صورت ہمیں انجام دینا ہے۔ اُردو پر اب بھی زبردست حملے ہو رہے ہیں اور وہ گوناگوں خطرات میں گھری ہوئی ہے اس لیے ہماری ذرا سی بھی غفلت یا بے خبری اُردو کے لیے مہلک ہوگی۔

گزشتہ بیس برس میں ملک میں نئی نئی تحریکات، نیز مختلف سیاسی نظریات و افکار نے جو بے چینی پیدا کردی ہے اس کے تیز و تند جھونکوں نے علمی زاویوں اور ادبی گوشوں میں بھی ہنگامہ پیدا کر دیا ہے اسی مقام پر جہاں آج ہم اُردو زبان کے ساتھ اپنی شیفتگی اور وابستگی کا مظاہرہ کرنے اور اس کی آیندہ ترقی و فلاح کے مسائل پر غور و بحث کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں چند ہی سال پہلے اس کی مخالفت بلکہ ہلاکت کی وہ تجویز مرتب کی گئی تھی جس کی زہرگیری و فتنہ آفرینی کے مقابلے میں سر انٹونی میکڈانلڈ (سابق لفٹننٹ گورنر یوپی) کی اُردو دشمنی بازیچۂ اطفال معلوم ہوتی تھی۔

عملی زندگی میں ہر ملک میں زبان کا معاملہ زیادہ تر تعلیم و عدالت کے محکموں سے تعلق رکھتا ہے۔ جدید سیاسی دستور میں یہ محکمے تمام تر صوبوں کی حکومت کے سپرد کر دیے گئے تھے اور پنجاب و بنگال کے علاوہ باقی صوبوں کی حکومتیں نیشنل کانگرس کے زیرِ اقتدار تھیں اور کانگرس کا سب سے بڑا رہنما ایک نئی مفروضہ زبان کو ملک میں رائج کرنے کا خواہاں تھا۔

اِن حریفانہ سرگرمیوں کی وجہ سے اُردو یا ہندستانی کی ترقی تو ایک طرف خود

اس کی زندگی معرضِ خطر میں پڑگئی تھی۔ یہ حالات تھے جنھوں نے مولوی عبدالحق صاحب جیسے زاویہ نشین کو میدان میں آکر مدافعانہ جدوجہد پر مجبور کیا اور ان کی سعی و تدبیر سے جو کام انجام پایا وہ آپ حضرات کے سامنے ہی۔

حضرات! صوبۂ متوسط اور اس میں بھی خصوصیت کے ساتھ اس شہر ناگ پور نے مولوی صاحب موصوف کی مدافعانہ جنگ میں جو حصّہ لیا وہ زبانِ اُردو کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ یہ کہا جاسکتا ہی کہ مولوی صاحب نے اُردو کی حمایت میں جو کوشش کی وہ بہ حیثیت معتمدِ انجمنِ ترقّیٔ اُردو ان کا فرض تھا، لیکن سوال یہ ہی کہ ہماری قوم میں ایسے کتنے آدمی ہیں جنھیں اپنے فرض کا احساس ہی اور وہ اسے انجام دینا چاہتے ہیں حالاں کہ وقت کا شدید مطالبہ ہی کہ ہم سب اپنا فرض انجام دیں۔

بے شبہہ یہ امر باعثِ مسرّت ہی کہ "انجمنِ ترقّیٔ اُردو" جو پہلے ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک شعبے کی حیثیت رکھتی تھی اب ترقّی کرکے ایک وسیع الاثر علمی و ادبی انجمن کے درجے پر پہنچ گئی لیکن یہ ترقّی کی آخری حد نہیں ہی بلکہ جیسا مَیں نے اوپر عرض کیا ہی ابھی بہت سا کام ہمارے کرنے کے لیے موجود ہی۔ کیوں کہ اُردو کی مخالفت مُلک میں اب بھی جاری ہی بلکہ اس میں روز بہ روز شدّت پیدا ہورہی ہی۔ اور اس ناکردہ گناہ زبان کے مٹانے کے لیے نئی نئی تدبیریں اختیار کی جارہی ہیں اس لیے ہمارا کام پہلے سے زیادہ بڑھ گیا ہی جو ہمیں بہرصورت انجام دینا ہی لیکن یہ ظاہر ہی کہ اس قسم کے کام وسیع الاثر قومی اداروں کے ذریعے سے انجام پاتے ہیں لہٰذا اس کی شدید ضرورت ہی کہ انجمن کے دائرۂ اثر کو وسعت دی جائے اور ایسی تدابیر اختیار کی جائیں کہ انجمن کی بنیاد مضبوط و مستحکم ہوجائے۔ واقعہ یہ ہی کہ اب تک بہی خواہانِ اُردو

نے انجمن کی کوئی قابلِ ذکر مالی امداد نہیں کی، بلکہ جیسا کہ باخبر اصحاب کو معلوم ہی اس وقت تک انجمن کے سب کام دولتِ آصفیہ کی مالی فیاضی یا مولوی عبدالحق صاحب اور ان کے مخصوص احباب کی اعانت سے ہوتے رہے ہیں قومی حیثیت سے ابھی تک انجمن کے لیے کوئی سرمایہ نہیں فراہم کیا گیا۔ دولتِ آصفیہ کی بروقت اور گراں قدر امداد شکریے سے بالاتر ہی۔ یہی خواہانِ اُردو اس کا جس قدر احسان مانیں وہ کم ہی لیکن ظاہر ہی کہ باوجود اس شاہانہ اعانت کے خود قوم میں امداد کا جذبہ پیدا ہونا چاہیے اور اجتماعی قوت سے اپنے قومی اداروں کو چلانا چاہیے۔

اگر آپ اُردو کو دُنیا کی بڑی اور ترقّی یافتہ زبانوں کے مانند ایک علمی و تعلیمی زبان بنانے کے آرزو مند ہیں اور اس غرض سے انجمنِ ترقّیٔ اُردو کے علمی مساعی کا دائرہ وسیع کرنا چاہتے ہیں تو لازمی طور پر آپ کو اس کے مصارف کا بار برداشت کرنا چاہیے۔ یہ ممکن ہی کہ آیندہ انجمن کی مطبوعات کا تجارتی کاروبار اس حد تک ترقّی کر جائے کہ اُسے بیرونی امداد اور عطایا سے بے نیاز کر دے لیکن بالفعل اُسے آپ کی مالی امداد کی سخت ضرورت ہی۔

حضرات! اس وقت انجمن کی سب سے بڑی ضرورت جو بلا تاخیر توجہ کی محتاج ہی یہ ہی کہ اس کے لیے ایک مستقل مکان و مستقر حسبِ ضرورت تعمیر کیا جائے۔ مجھے معلوم ہوا ہی کہ نئی دہلی میں ایک وسیع قطعۂ زمین کا ملنا اب یقینی ہوگیا ہی اور انجمن کی مجوزہ عمارتوں کے لیے تین سال سے کچھ سرمایہ بھی جمع کیا جارہا ہی لیکن ابھی مالی امداد کی رفتار بہت سست ہی اس کے علاوہ یہ اندیشہ پیدا ہوگیا ہی کہ اگر جنگ ختم ہونے کے بعد بھی عمارتی سامان کی یہی گرانی رہی تو تعمیر کا پہلا سرسری تخمینہ جو دو لاکھ رُپے کیا گیا تھا

ہرگز کافی نہ ہوگا۔ مجھے امید ہی کہ آنزیری سکریٹری صاحب اس بارے میں آپ کو تفصیلی حالات بتائیں گے، میرا مقصد صرف یہ یاد دلانا تھا کہ ایک مستقل و موزوں عمارت کی تعمیر انجمن کی سب سے مقدّم و ناگزیر ضرورت ہی جس کے لیے ابھی سے سرمایہ جمع ہونا چاہیے تاکہ مناسب وقت آنے اور حالات سازگار ہونے پر بلا تاخیر تعمیری کام شروع کردیا جائے۔

حضرات! اب میں ایک اور مسئلے پر آپ کی توجہ مبذول کرتا ہوں جس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہی۔ وہ اُردو کے تحفظِ حقوق کا مسئلہ ہی۔ واقعہ یہ ہی کہ موجودہ زمانے میں کوئی مسئلہ خواہ وہ خالص تعلیمی معاملات سے تعلق رکھتا ہو یا زبان اور مذہب سے، مُلکی سیاست سے جُدا نہیں ہوسکتا۔ مثال کے طور پر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کو لیجیے جیسا کہ اس کے نام اور اساسی مقاصد سے ظاہر ہی وہ ایک خالص تعلیمی انجمن ہی اس لیے اُس کے سالانہ اجلاس میں ہمیشہ مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات اور مشکلات پر بحث کی جاتی ہی لیکن ان میں سے اکثر مسائل خصوصاً وہ جو حکومت کے تعلیمی احکام یا سرشتۂ تعلیمات سے تعلّق رکھتے ہیں، کسی نہ کسی طرح سیاست کے دائرے میں آجاتے ہیں۔ کانفرنس کے ہر سالانہ اجلاس میں جو رزولیوشن پاس ہوتے ہیں ان پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہر شخص یہ اندازہ کرسکتا ہی کہ ان میں سے اکثر رزولیوشن ایسے ہیں جو باوجود تعلیم سے متعلّق ہونے کے ملکی سیاست کے دائرے میں شامل ہیں۔

یہی کیفیت ان مسائل کی ہی جو اُردو کے تحفّظ و ترقّی یا اُردو ہندی کے قضیۂ نامرضیہ سے تعلّق رکھتے ہیں۔ یہ خالص لسانی و ادبی مباحث ہیں لیکن آپ روزمرّہ دیکھتے ہیں کہ ہندُستان کے بہت سے ممتاز و مشہور سیاسی لیڈر

جن میں اکثر غالباً ذوقِ ادب سے عاری ہیں، ان لسانی مسائل سے کس قدر دل چسپی رکھتے ہیں۔ ظاہر ہی کہ ان کی یہ دل چسپی محض سیاسی نقطۂ نظر سے ہی۔

ان تصریحات سے میرا مقصد یہ ہی کہ چوں کہ بہ حالتِ موجودہ کوئی مسئلہ بھی یکسر سیاست سے جُدا نہیں ہوسکتا لہٰذا زبانِ اُردو کے تحفّظ و ترقّی کے سلسلے میں بھی ایسے مسائل پیش آسکتے ہیں جو سیاسی نقطۂ نظر سے بھی لائقِ بحث و گفتگو ہوں گے، اور ان کے حل کرنے کے لیے آئینی جدوجہد یا ایجی ٹیشن اور مُلک کی عام رائے کو تیّار کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ اب سوال یہ ہی کہ یہ جدوجہد کس جماعت یا قومی ادارے کا کام ہونا چاہیے؟ میرا خیال ہی کہ یہ کام انجمن ترقّیٔ اُردو کو انجام دینا چاہیے ـــــ یعنی جس طرح مسلمانانِ ہند کے تعلیمی معاملات کے متعلّق آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس مسلّمہ طور پر ایک ذمّے دار مرکزی جماعت ہی یا سیاسی معاملات کے لیے آل انڈیا مسلم لیگ جدوجہد کرتی ہی اسی طرح اُردو کے تحفظ و ترقی میں جو کام سیاسی نوعیت رکھتا ہی اس میں انجمن کی مرکزی حیثیت تسلیم کی جائے اور دوُسرے علمی و ادَبی ادارے جو زبان کی خدمت کررہے ہیں اس معاملے میں انجمن سے تعاون کریں۔

اس تحریک کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہی کہ ہندُستان کے دوُسرے علمی یا ادَبی ادارے جو اپنی اپنی جگہ مفید کام کررہے ہیں انجمنِ ترقّیٔ اُردو کے ماتحت ہوجائیں۔ بلکہ مقصد یہ ہی کہ انجمن کی آواز کو علمی و لسانی اعتبار سے نہ سہی لیکن سیاسی اعتبار سے ہندُستان بھر کی اُردو دُنیا کی آواز تسلیم کیا جائے تاکہ انجمن قوم کی تائید و حمایت سے قوّت حاصل کرکے زیادہ جرأت و استقامت سے اپنا فرض انجام دے سکے۔ مَیں نے اجمالاً اپنے خیالات کا اظہار کیا ہی۔ انجمن کے اربابِ حل و عقد غور و بحث کے بعد تفصیلات

طے کرسکتے ہیں۔ انجمن کو یہ حیثیت دینے کے لیے اگر اس کے قانونِ اساسی اور
ہیئتِ ترکیبی میں اصلاح یا ترمیم کی ضرورت پیش آئے تو اس میں بھی تامّل
نہیں کرنا چاہیئے۔ اُردو کانفرنس کے عام اجلاس میں بھی اس قسم کی تجاویز پیش
کرکے ان پر بحث کی جاسکتی ہو۔

بے شبہہ تالیف و تصنیف کے ذریعے سے اُردو کے علمی و ادبی
خزانے میں اضافہ کرنا بھی زبان کی ایک گراں قدر خدمت ہو لیکن اُردو جن
خطرات میں گھری ہوئی ہو اُن کا تقاضا یہ ہو کہ اب اس دائرے کے باہر بھی
قدم بڑھایا جائے۔ اور مُلک کے تمام علمی و ادبی اداروں کا تعاون حاصل کرکے
اُردو کے تحفظ و ترقی کے لیے دوسری عملی تدابیر بھی اختیار کی جائیں۔

اسی سلسلے میں یہ بھی ضروری ہو کہ آیندہ انجمن کو عام اُردو بولنے والوں
کی انجمن بنایا جائے تاکہ عوام یہ محسوس کریں کہ وہ صرف علما یا مصنّفین کی کوئی
جماعت نہیں ہو۔ طریقۂ عمل کی اس تبدیلی سے عوام کی دل چسپی انجمن کے ساتھ
بڑھ جائے گی جو انجمن کے لیے مفید ثابت ہوگی۔ اس لیے یہ ضروری ہو کہ
انجمن کی ممبری کے لیے قواعد میں ایسی تبدیلی کی جائے کہ ہر اُردو خواں کم از کم
اس کا معمولی ممبر بن سکے۔

انجمن کا صدر دفتر اگرچہ دہلی میں ہو لیکن انجمن کا دائرۂ عمل چوں کہ دہلی
تک محدود نہیں اس لیے انجمن کا یہ فرض ہو کہ ہندُستان کے مختلف صوبوں
اور بڑی ریاستوں میں اُردو کے سلسلے میں جو حالات پیش آئیں اُن سے باخبر
رہے اور اُن کے متعلق ضروری تدابیر اختیار کرنے کی غرض سے ہر ایسے علاقے
میں ایک نمایندہ انجمن یا جماعت قائم کردے جو صوبہ یا ریاست کے ایسے
معاملات میں جو اُردو سے تعلق رکھتے ہیں مرکزی انجمن سے امداد و مشورہ

حاصل کر کے حسبِ ضرورت کام کرتی رہے، اور جو معاملات سارے ہندستان سے تعلق رکھتے ہیں اُن میں مرکزی انجمن کی تائید و ہم آہنگی کا کام انجام دے۔ البتہ اگر صوبوں یا ریاستوں میں کوئی نمایندہ جماعت قائم نہ ہوسکے تو مرکزی انجمن کے لیے یہ مناسب ہوگا کہ وہ ہر صوبے یا بڑی ریاست کے صدر مقام پر خود ہی کوئی اپنا نمایندہ مقرر کردے جو مختلف مقامات پر انجمن کی شاخیں قائم کرنے کے علاوہ اُردو زبان کے متعلق ضروری معلومات مرکزی انجمن کو فراہم کرتا رہے۔

حضرات! ہمارا ایک فرض یہ بھی ہے کہ ان سب ادبی اداروں کی خدمات کا اعتراف کریں جو کسی نہ کسی طور پر زبانِ اُردو کی خدمت میں مصروف ہیں۔ اسی سلسلے میں ہم سب کو خصوصیت کے ساتھ خسروِ دکن و برار اعلاحضرت نظام خلد اللہ ملکہٗ کا بھی شکر گزار ہونا چاہیے جن کی شاہانہ فیاضی و معارف نوازی کی بدولت جامعہ عثمانیہ وجود میں آئی اور جامعہ عثمانیہ کے لیے "دار الترجمہ" قائم ہوا جس کی وجہ سے مختلف علوم و فنون کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ علومِ جدیدہ کے متعلق اعلا تعلیم، مفید و بلند پایہ تصنیفات و تراجم کا اُردو زبان میں بیش بہا اضافہ ہوگیا۔

اسی طرح اعظم گڑھ کا مشہور و معروف علمی و ادبی ادارہ دار المصنفین بھی ہمارے شکریے کا مستحق ہے جس نے اسلامی تاریخ اور ادب وغیرہ کے متعلق بہت سی معیاری کتابیں شائع کرکے ہمارے لٹریچر کا درجہ بہت بلند کردیا ہے۔

ایم۔ اے۔ او کالج کے بانی سر سید مرحوم اور اُن کے رفقا اور جانشینوں نے اُردو کی جو خدمت کی ہے اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ آج بھی مسلم یونی ورسٹی میں اُردو کا شعبہ قائم ہے جو مفید و لائقِ قدر خدماتِ ادبی انجام دے رہا ہے۔ اس

شعبے کے صدر ہندستان کے علمی و ادبی حلقوں میں خاصی شہرت رکھتے ہیں شعبے کے دوسرے اُستاد بھی علاوہ اپنے تعلیمی فرائض انجام دینے کے تالیف و تصنیف کی خدمت بھی انجام دیتے ہیں۔

حضرات! اب آخر میں مکرّر یہ آپ سب صاحبوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے صوبۂ متوسط و برار کے حامیانِ اُردو کو مبارک باد دیتا ہوں کہ ان کی حوصلہ مندی اولوالعزمی کی وجہ سے اُردو کانفرنس کا یہ شان دار اجلاس ناگ پور میں منعقد ہوا۔ مجھے امید ہو کہ انشاء اللہ یہ اجلاس انجمنِ ترقیِ اُردو میں ایک حیاتِ تازہ پیدا کرنے کا باعث ہوگا اور اس کی عملی قوتوں کو تیز کردے گا۔

مَیں آپ سب حضرات کا شُکرگزار ہوں کہ آپ نے صبر کے ساتھ میری تقریر کو سُنا اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

سکریٹری کی رپوٹ

اس فاضلانہ خطبۂ صدارت کے بعد جناب ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے انجمن کی رپوٹ سُنائی جو علاوہ اور ضروری امور کے پچھلی کانفرنس کے بعد سے اب تک کی کارروائی اور انجمن کے مساعی جمیلہ کے کوائف پر مشتمل تھی یہ رپوٹ ذیل میں درج کی جاتی ہو:۔

جناب صدر اور معزز حاضرین!

مجھے اس موقع پر انجمن کی تاریخ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ جو اصحاب یہاں تشریف رکھتے ہیں وہ کم وبیش اس کے حالات سے واقف ہیں۔ اس وقت صرف مختصر کیفیت اُس کارگزاری کی عرض کروں گا جو انجمن نے گزشتہ چند سال میں انجام دی ہو۔

آخر دسمبر ۱۹۰۳ء میں جب اوّل اوّل اس کی بنیاد رکھی گئی تو اس کا مقصد اَدبی اور علمی قرار دیا گیا تھا۔ یعنی ترجمے، ترتیب و تالیف کے ذریعے اُردو زبان کے اَدبی و علمی سرمایے میں اضافہ کرنا۔ اس مقصد کی ۱۹۳۶ء تک پوری پوری پابندی کی گئی۔ انجمن اس وقت تک کبھی کسی موقع پر اختلافی بحثوں میں نہیں پڑی تھی، حالاں کہ اِس دورانِ مدّت میں اُردو پر بارہا سخت اور تند حملے ہوئے اور باوجود اشتعال انگیز تحریروں، دل آزار تقریروں اور ناروا اور نازیبا پروپیگنڈے کے انجمن نے ہرگز اپنی حد سے قدم باہر نہ رکھا اور اپنی بساط کے مطابق جہاں تک سرمایے نے مساعدت کی، کتابیں لکھنے لکھانے اور شائع کرنے میں لگی رہی۔ لیکن ۱۹۳۶ء میں ایک نئے دَور کا آغاز ہوا۔ انجمن کی زندگی میں یہ بڑا انقلاب تھا۔ یہ انقلاب اسی شور انگیز اور شور بخت سرزمین میں رونما ہوا۔ اپریل ۱۹۳۶ء میں اکھل بھارتیہ ساہتیہ پرشد (سبحان اللہ کیا پیارا نام ہے) کے بھرے اجلاس میں جو ناگ پور یونی ورسٹی کے ہال میں منعقد ہوا، گاندھی جی سے اُردو ہندی کے متعلق گفتگو اور بحث ہوئی۔ اور اس کا جو انجام ہوا وہ آپ سب کو معلوم ہے۔ پرشد کے فیصلے اور گاندھی جی اور ان کے رفقا کے اِس اعلان نے کہ "وہ ہندی کو ہندُستان کی عام زبان بناکر رہیں گے"، ہمیں خوابِ خرگوش سے بیدار کیا۔ اُس وقت ہماری آنکھیں کھُلیں اور ہم سمجھے کہ کمروں میں بیٹھ کر کاغذ سیاہ کرنے اور قلم گھسنے سے کیا حاصل، اور یہ سب کچھ کس دن کے لیے اور کس کے لیے؟ آخر میں انجمن کے اغراض و مقاصد میں ایک مقصد اور بڑھانا پڑا، اور وہ تھا "اُردو زبان کی اشاعت و حفاظت"۔ انجمن اب میدان میں آئی۔ پہلی مہم کا آغاز اسی شہر سے ہوا جسے مَیں نے اس کے بعد سے جاگ پور کا نام دیا کیوں کہ اسی نے ہمیں اور آپ کو جگایا تھا۔ یہاں انجمن کی شاخ قائم کی۔ کانگرس

گورمنٹ کے وزیروں سے خط وکتابت کی، ملاقات کی، وفد لے کر گئے، اپنے
مطالبے پیش کیے، اُردو کی حمایت میں جلسے کیے۔ ودیا مندر اسکیم سے سب سے
پہلے انجمن نے اختلاف کیا۔ اس بارے میں وزیرِ تعلیم سے ملاقات کی اور مراسلت
بھی کی، گاندھی جی کو کھلی چٹھی لکھی۔ اس کے بعد یہ بحث کُل ہند مسئلہ بن گئی۔ انجمن
کے مستعد کارکن سید علی شبر نے اپنے رفیقوں کے ساتھ اس صوبے کا دورہ کیا
اور شہر شہر اور گانو گانو میں انجمن کے مقاصد کی تبلیغ کی اور انجمن کی شاخیں قائم
کیں۔ غرض جو جو ممکن طریقے ہو سکتے تھے عمل میں لائے گئے۔ اور اس کے بعض
سرگرم ارکان خصوصاً حکیم اسرار احمد صاحب اور ابراہیم خاں صاحب، نواب صدیق علی
خاں صاحب، نواب محی الدین خاں صاحب، مرزا اسمٰعیل بیگ صاحب نے
جس جاں فشانی، بے جگری اور ایثار سے کام کیا وہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ یہ اسی کا
نتیجہ ہے کہ اب یہاں اُردو کا عام رواج ہو رہا ہے۔ اُردو جسے یہاں کوئی منھ نہیں
لگاتا تھا آج گھروں میں، بازاروں اور جلسوں میں اسی کا بول بالا ہے۔ انھی
کوششوں کا یہ اثر ہے کہ یہاں کے کالجوں میں جہاں اُردو کی پُرسش نہ تھی
اب اُردو زبان کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ہر کالج میں بزمِ اُردو ہے اور ان کے
علاوہ یونی ورسٹی اُردو لٹریری سوسائٹی الگ ہے جو اُردو کی خدمت انجام دیتی ہے
خاص کر خواتین نے اس بارے میں جو کام کیا ہے اور کر رہی ہیں وہ بہت قابلِ
تحسین ہے۔ اسی بنا پر اس صوبے کا انجمن پر اور انجمن کا اس صوبے پر بہت بڑا
حق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے علی گڑھ اور دلّی کے بعد تیسری کُل ہند اُردو
کانفرنس کا اجلاس یہاں منعقد کیا ہے۔ انجمن سے اس صوبے کا تعلق اتنا قوی ہو گیا
ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔

انجمن کے سکریٹری کی حیثیت سے یہاں تو خیر میں بار بار آیا لیکن ہندستان

کے دوسرے صوبوں اور علاقوں میں بھی اسی غرض سے دورے کیے۔ بنگال، بہار، یوپی، سندھ، کشمیر، گوالیار، رانچی (چھوٹا ناگ پور)، جنوبی ہند میں مدراس، آندھرا، شمالی ارکاٹ، جنوبی ارکاٹ، ملیبار، ٹامل ناڈ، ٹراونکور تک گیا اور راس کماری پر جاکر دم لیا۔ لوگ مبالغے سے "کشمیر سے راس کماری تک" کا فقرہ کہا کرتے ہیں لیکن میں نے حقیقت میں کشمیر سے راس کماری تک کی خاک چھانی ہو اور آپ کو یہ سُن کر حیرت اور خوشی ہوگی کہ مجھے راس کماری میں بھی اُردو بولنے والے ملے۔ اِن مقامات میں جگہ جگہ تقریریں کیں، اُردو مدرسے دیکھے، لوگوں کو اُردو کی امداد کے لیے آمادہ کیا، انجمن کی شاخیں قائم کیں، مدرسے کھولے، معترضین کے جواب دیے، غلط فہمیوں کا ازالہ کیا اور غلط بیانیوں کی تردید۔ جہاں جہاں اُردو پر آنچ آئی سینہ سپر ہوکر لڑے۔ کہیں کام یابی ہوئی کہیں ناکامی۔ کام یابی سے پھول کر غافل نہ ہوئے اور ناکامی سے ہماری آس نہ ٹوٹی۔ ہم برابر کام میں لگے رہے اور یہی ہماری زندگی کا مشن ہو۔

اس جلسے میں انجمن کی گزشتہ چند سالہ کارگزاریوں کا تفصیل سے تو کیا اجمال سے بھی بیان کرنے کا نہ تو کافی وقت ہو اور نہ سننے والوں میں اتنا صبر لہٰذا نہایت اختصار کے ساتھ صرف چند باتیں عرض کرتا ہوں۔

(۱) پنجاب یونی ورسٹی میں اُردو ادب کے امتحانات تو ہوتے ہیں لیکن اُن کے لیے تعلیم کا کوئی انتظام نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہو کہ اکثر طلبا ناکام رہتے ہیں اور جو کام یاب ہوجاتے ہیں ان میں اُردو زبان و ادب کا صحیح ذوق رکھنے والے بہت کم ہوتے ہیں۔ امیدواروں کی عام خواہش اور ضرورت کی بنا پر انجمن نے اس غرض کے لیے دہلی میں **اُردو کالج** قائم کیا۔ جس میں ادیب، ادیبِ عالم، ادیب فاضل کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہو۔ اس کے نتائج نہایت

اچھے رہے۔ اس میں پڑھانے والے سب عالم فاضل اور مخلص حضرات ہیں علامہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی اس کے پرنسپل ہیں اور تعریف کی بات یہ ہو کہ سب کے سب اعزازی طور پر کام کرتے ہیں۔

(۲) یورپین اور اینگلو انڈین جماعت میں اُردؤ کو مقبول بنانے اور ان کے مدارس میں اُردؤ کی ترویج اور اصلاحِ نصاب کا مسئلہ بھی میرے زیرِ غور تھا۔ اس کے متعلق بعض یورپین مدارس کے پرنسپلوں سے مراسلت بھی کی۔ آخر اینگلو انڈین فرقے کے لیڈر سر ہنری گڈنی آں جہانی سے مل کر اس بارے میں گفتگو کی۔ انھوں نے میرے اس خیال کی پُرزور تائید کی۔ میری اُن کی مراسلت شائع ہوچکی ہو۔ ان تمام کوششوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ یوپی کے یورپین اور اینگلو انڈین اصحاب نے اپنی کمیٹی میں کافی غور اور بحث کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ اُن کے مدارس میں اُردؤ دؤسری لازمی زبان ہوگی اور اس کا بدل کوئی دؤسری ہندستانی زبان نہیں ہوسکتی اور ہندی وہ اپنے مدارس میں نہیں پڑھائیں گے۔ علاوہ یوپی کے دؤسرے صوبوں کے یورپین اور اینگلو انڈین مدارس میں بھی اُردؤ پڑھائی جاتی ہو۔ تعلیمی امور کا فیصلہ اُن کی مقتدر اور بااثر مجلس بہ نام "انٹر پراونشل بورڈ فار اینگلو انڈین اور یورپین ایجوکیشن" میں ہوتا ہو۔ اس بورڈ میں مجھے انھوں نے اپنی لینگوایج کمیٹی کا ممبر بنالیا ہو۔ اس کمیٹی کا ایک اجلاس گزشتہ سال دہلی میں ہوا اور دؤسرا شملہ میں۔ مجلس کے فیصلے کے مطابق ان مدارس کے لیئے اُردؤ ریڈریں اور کتابیں مرتب کرانے کا کام میرے تفویض کیا گیا ہو۔

(۳) بریلی اور آگرہ کے کالجوں میں اُردؤ ایم۔ اے جماعتیں نہ تھیں۔ کئی بار تحریک ہوئی لیکن کسی نہ کسی وجہ سے یہ معاملہ التوا میں رہا۔ اب ان کالجوں میں ایم اے کی جماعتیں کھُل گئی ہیں۔ اس میں انجمن کی کوشش اور امداد کو

بھی دخل ہے۔

(۴) سب سے عجیب اور حیرت کی بات یہ ہے کہ دہلی یونی ورسٹی میں سرے سے اُردو تھی ہی نہیں۔ یہ کیسی ستم ظریفی کی بات ہے کہ مدراس اور ناگ پور کی یونی ورسٹیوں میں تو اُردو ہو اور نہ ہو تو دہلی یونی ورسٹی میں۔ اس غرض سے انجمن کا ایک وفد دہلی یونی ورسٹی کے وائس چانسلر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ہم نے اپنے مطالبے پیش کیے اور دیر تک گفتگو رہی۔ ہمارے مطالبے قلم بند کر لیے گئے اور وعدہ کیا گیا کہ عنقریب یونی ورسٹی کا نظامِ تعلیم تغیّر و تبدّل ہونے والا ہے اس وقت ان امور کو پیشِ نظر رکھا جائے گا۔ خدا خدا کرکے اب اُردو کو دہلی یونی ورسٹی میں باریابی کا موقع ملا ہے۔

(۵) انجمن نے ۱۹۴۱ء میں ایک نئے کام کا آغاز کیا یعنے چھوٹا ناگ پور کے لیے رانچی میں اُردو مرکز قائم کیا۔ چھوٹا ناگ پور میں ہندُستان کی سب سے قدیم اقوام آباد ہیں، آریوں اور دراوڑیوں سے بھی قدیم۔ وہاں رومن کیتھولک مشنریوں کا راج ہے، آج سے نہیں، ایسٹ انڈیا کمپنی کے وقت سے۔ پہلے تو مشنری ہم سے بدظن رہے لیکن جب انھیں اطمینان ہو گیا کہ ہم مذہب کی تبلیغ کرنے نہیں آئے تو بہ خوشی ہم سے تعاون کیا۔ اب ان کے تقریباً تمام مدارس میں اُردو پڑھائی جاتی ہے۔ باوجود نامساعد حالات کے ہم اب تک کم و بیش ڈیڑھ ہزار اشخاص کو اُردو پڑھا چکے ہیں اور اس وقت تقریباً ۷۰۰ زیرِ تعلیم ہیں۔ جن میں سے ساڑھے چار سو مختلف مشنوں کے عیسائی ہیں۔ دن کے مدرسوں کے ساتھ ہم نے شبینہ مدرسے بھی جاری کیے ہیں اور رانچی کے علاوہ دیہات میں بھی مدرسے کھولے ہیں۔ دیہات کے یہ مدرسے پادریوں نے اپنی نگرانی میں لے لیے ہیں۔ مسلمان بچوں کے مدرسے الگ ہیں۔ مثالاً موضع اربا مسلمانوں کا گانو ہے

وہاں ایک مدت سے لور پرائمری مدرسہ تھا لیکن لور پرائمری کے بعد ان بچوں کا
تعلیم جاری رکھنا ممکن نہ تھا۔ یا تو وہ اپر پرائمری میں جاکر ہندی پڑھتے یا تعلیم ترک
کردیتے تھے۔ موضع والوں نے ہمارے مرکز سے رجوع کیا اور مدرسہ انجمن کی
نگرانی میں دے دیا۔ اب یہ مدرسہ اپر پرائمری بنادیا گیا ہی اور امید ہی کہ آیندہ مڈل
تک پہنچ جائے گا۔ رومن کیتھولک مشنری بڑی مستعدی سے ہمارا ساتھ دے
رہے ہیں اور اپنے اسکولوں میں اُردو رائج کررہے ہیں۔ اُن کی ننیں (Nuns)
اور سسٹریں (Sisters) بڑے شوق سے اُردو پڑھ رہی ہیں۔ عجیب
بات یہ ہی کہ عیسائی مردوں اور لڑکوں سے زیادہ عورتیں اور لڑکیاں شوق
سے اُردو سیکھتی ہیں۔ ان کے اِملا کی کاپیاں میرے پاس آتی ہیں۔ یہ دیکھ کر
حیرت ہوتی ہی کہ چند مہینے میں وہ اُردو لکھنا پڑھنا سیکھ جاتی ہیں اور خط تو ان کا
ایسا اچھا ہی کہ ہمارے گریجویٹوں کو بھی رشک آئے۔ آخر ۱۹۴۲ء میں ہم نے
لارڈ بشپ رانچی کی خدمت میں ایک طویل خط لکھا جس میں اُردو زبان اور اس
کی تعلیم کی اہمیت اور خصوصیت کے ساتھ عیسائی حلقوں میں اس کی ضرورت
کو جتایا تھا۔ اس کے ساتھ اُردو تعلیم کی اشاعت کے سلسلے میں ایک مختصر سی
اسکیم بھی پیش کی گئی تھی۔ ہز گریس نے ہمارے خیالات سے پورا اتفاق کیا،
ہمارے مقصد سے ہم دردی ظاہر کی اور ہماری پیش کردہ اسکیم کو منظور کیا یعنی
رومن کیتھولک کے دو ٹریننگ اسکولوں میں اُردو کا جاری کرنا منظور فرمایا اور
جنوری ۱۹۴۳ء سے ایک ٹریننگ اسکول میں جو اُستانیوں کا ہی اُردو تعلیم شروع
کردی گئی چناں چہ ۴۲ لڑکیاں اور وہاں کی مدر اور سسٹریں اُردو کی تعلیم حاصل
کررہی ہیں۔ اُستادوں کے مدرسے میں فی الحال اس لیے انتظام نہ ہوسکا کہ
تنگی کی وجہ سے رانچی سے مشن کے مختلف شعبے ایسے چھوٹے مقامات پر

بھیج دیے گئے ہیں جہاں مدرس کے رہنے کے لیے جگہ نہیں مل سکی۔ کوشش کی جارہی ہو کہ یہ دُشواری کسی طرح رفع ہوجائے تاکہ مردوں کے ٹرینِنگ اسکول میں اُردو تعلیم جاری ہوجائے۔ رومن کیتھولک پادریوں میں اُردو کا کافی شوق پیدا ہوگیا ہو۔ چناں چہ ایک جیسواٹ پادری فادر کرتوائنے خاص طور پر اُردو زبان کی تحصیل کے لیے لکھنؤ اور دلّی کا سفر کیا۔ دلّی میں تقریباً دو ماہ تک وہ میرے مہمان رہے اور تمام وقت اُردو زبان کے پڑھنے اور سمجھنے میں صرف کرتے تھے۔ ایک دوسرے پادری فادر فان اکسم جس نے ہمارے مرکز میں اُردو پڑھی لکھنؤ پہنچ گئے ہیں۔ اب جلد دہلی آنے والے ہیں۔ اب ہماری نظر سنتھال پرگنہ اور کرسیانگ پر ہو اور اس بارے میں وہاں کے مشنریوں سے گفتگو کا سلسلہ جاری ہو۔ کل ہی اطلاع پہنچی ہو کہ کرین نگر کے بیس پادریوں نے اُردو پڑھنی شروع کردی ہو اور بڑے شوق سے پڑھ رہے ہیں۔ چھوٹا ناگ پور اُردو مرکز کے مہتمم سہیل عظیم آبادی صاحب نے جس خلوص اور سرگرمی سے کام کیا ہو وہ نہایت قابلِ تعریف ہو۔ جمشید پور کا اُردو کریمیہ اسکول بھی ہمارے مرکز کی نگرانی میں آگیا ہو۔

(۶) کشمیر میں ہندی کو بڑی ہوشیاری اور عجیب ڈھنگ سے نصابِ تعلیم میں داخل کیا گیا ہو۔ ہندی نہ وہاں کی زبان ہو اور نہ اہلِ کشمیر کی طرف سے اس کا مطالبہ تھا لیکن بعض بیرونی اثرات کی وجہ سے یہ طریقہ اختیار کیا گیا جس کے نتائج بہت ناگوار اور مضر ہوں گے۔ حکومت نے تعلیمی تنظیم کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی تھی اور اس کے ارکان بھی حکومت ہی نے انتخاب کیے تھے۔ کمیٹی نے کامل غور اور بحث کے بعد متفقہ طور پر یہ طے کیا تھا کہ جو طریقہ اس وقت رائج ہو وہی مناسب ہو۔ لیکن حکومت نے اس کی مطلق پروا نہ کی۔ انجمن نے اس پر احتجاج کیا اور اپنے اخبار میں متعدد مضامین لکھے اور آخر کار میں خود وہاں

گیا اور ڈیڑھ مہینے تک برابر کوشش کرتا رہا۔ چوں کہ اس کے متعلق کانفرنس میں رزولیوشن پیش ہونے والا ہی لہٰذا یہاں تفصیلی ذکر کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

(۷) جےپور میں اُردو کے ساتھ جو ناانصافی برتی گئی ہی اس کا حال آپ سب صاحبوں کو معلوم ہی اور انجمن نے اس باب میں جو سعیِ بلیغ کی وہ بھی آپ پر روشن ہی اس لیے اس کا اعادہ غیر ضروری معلوم ہوتا ہی۔ لیکن اس قدر کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جےپور کے وزیرِ اعظم نے جس بے دردی اور بھونڈے پن سے اس کام کو کیا وہ نہایت قابلِ افسوس ہی۔

(۸) آپ کو یہ سُن کر خوشی ہوگی کہ کابل کے ٹریننگ کالج میں اُردو زبان کی تعلیم لازمی قرار دے دی گئی ہی۔ اس میں انجمن کی کوشش کو بھی دخل ہی۔ انجمن نے اس بارے میں افغانستان کے وزیرِ اعظم سردار محمّد ہاشم خاں صاحب سے مراسلت کی اور نواب صدر یار جنگ بہادر اور مولانا محمّد سلیمان ندوی صاحب سے بھی وزیرِ اعظم کے نام خط لے کر بھجوائے۔ شکر ہی کہ انجمن کی کوشش ٹھکانے لگی۔

(۹) ایک دوسری خوش خبری انجمن کی کام یابی کی میں آپ کو یہ سُناتا ہوں کہ اس مہینے کے شروع میں جنرل سکریٹری ادی باسی مہا سبھا چھوٹا ناگ پور کی اطلاع سے معلوم ہوا کہ سبھا نے اپنے اسکول میں اُردو کی پڑھائی لازمی کردی ہی۔ ادی باسی سے مُراد ہندستان کی قدیم ترین اقوام ہیں۔

(۱۰) لیکن اس نئے مقصد کے پیچھے ہم نے اپنے پہلے مقصد کو نہیں بھلایا۔ بلکہ اس کے بعد سے ہماری مطبوعات کی تعداد کئی گُنا زیادہ ہوگئی اور ہم نے گزشتہ تین سال میں ۸۳ کتابیں طبع کرکے شائع کیں۔ انجمن نے اپنی تجویز کے مطابق جس کا خاکہ بیس سال ہوئے تیار کیا تھا، ایسے قدیم تذکرے جن کے نام کتابوں میں کہیں کہیں ملتے تھے مگر ان کا وجود ناپید تھا، بڑی جستجو

اور صرفِ کثیر سے بہم پہنچائے۔ ان میں سے بعض کا دُنیا میں صرف ایک ہی نسخہ تھا اور بعض کے دو ایک سے زیادہ نہ تھے۔ یہ تذکرے ہمارے قدیم شعرا کی سیرت، ان کے طرزِ خیال اور طرزِ بیان اور اس زمانے کی معاشرت و تمدن کے سمجھنے اور صحیح تاریخِ ادب لکھنے کے لیے نہایت ضروری ہیں۔ انجمن نے ان سب کو صحت و احتیاط کے ساتھ مرتب کرکے شائع کیا۔ نیز انجمن نے اُردو زبان کی قدیم کتابوں کی اشاعت یا ان پر تنقیدی تبصرے لکھ کر ملک کو اُردوے قدیم سے روشناس کیا اور اُردو زبان کی تاریخِ ادب میں ایک انقلاب پیدا کردیا، جس سے بہ قول ایک فاضل نقاد کے اُردو کی عمر میں دو سو سال کا اضافہ ہوگیا۔ اِن کتابوں سے ابتدائی زبان کی کیفیت اور ارتقائی نشو و نما کی حالت معلوم ہوتی ہے اور زبان و ادب کے مورخ کے لیے ان کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ان میں سے اکثر وہ کتابیں ہیں جن کے نام سے بھی کوئی واقف نہ تھا۔ یہ کام انجمن نے کئی سال پہلے سے شروع کر رکھے تھے اور اب بھی جاری ہیں۔

انجمن نے مختلف قسم کی لغات کا سلسلہ شائع کرنا شروع کیا تھا جن میں سے بعض مثلاً انگریزی اُردو کی جامع لُغات، فرہنگ اصطلاحاتِ علمیہ تین جلدوں میں، فرہنگ اصطلاحاتِ پیشہ وران چھ جلدوں میں شائع ہوچکی ہیں۔ عربی اُردو اور ہندی اُردو کی لغات زیرِ ترتیب و تالیف ہیں۔

اس کے علاوہ دنیا کی متعدد امہاتِ کتب کے ترجمے شائع کیے۔ ان میں عربی، سنسکرت، فارسی، فرانسیسی، جرمن، انگریزی وغیرہ کی کتابیں ہیں۔ نیز سائنس کی مختلف شاخوں، فلسفہ، تعلیم، تاریخ، سوانح، حفظانِ صحت، معاشیات، تنقید اور دیگر علوم پر بہت سی کتابیں شائع کیں۔ یہ ایک بیش بہا خزانہ ہے جو انجمن کی بدولت اُردو ادب کو حاصل ہوا ہے۔ کسی ادارے نے

اُردو داں طبقے کے لیے علمی و ادبی معلومات کا ایسا ذخیرہ بہم نہیں پہنچایا۔

(۱۱) گزشتہ سال مولوی سید ہاشمی صاحب نے اصلاحِ رسمِ خط کے متعلق ایک تجویز پیش کی جو خاص خاص اصحاب کی خدمت میں رائے کے لیے بھیجی گئی۔ پھر ایک کمیٹی میں جس کے صدر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب ہیں اس پر غور کیا گیا اور جو امور طے ہوئے اس کی رپوٹ 'ہماری زبان' میں شائع کی گئی۔ اس کے بعد مزید رائیں وصول ہوئیں۔ کل، اصلاحِ رسمِ خط کی کمیٹی میں یہ مسئلہ پیش ہوگا اور اس میں جو اصلاحیں منظور ہوں گی ان پر عمل درآمد کی کوشش کی جائے گی۔

(۱۲) گزشتہ نومبر میں ہماری سائنس کمیٹی نے سائنس کی مختلف شاخوں پر کتابیں تالیف کرنے کا ایک سہ سالہ پروگرام بنایا جس میں صراحت کے ساتھ یہ طے کر دیا ہو کہ ہر کتاب کا کیا موضوع ہوگا۔ کس قدر حجم ہوگا اور کون لکھے گا۔ اس سال سے کام شروع ہوگیا ہو۔ اس میں نیز رسالہ 'سائنس' کی ترتیب میں جامعۂ عثمانیہ کے پروفیسروں نے جو قابلِ قدر امداد دی ہو وہ بہت قابلِ شکرگزاری ہو۔

(۱۳) انجمن کے دو رسالے یعنی 'اُردو' اور 'سائنس' پہلے سے جاری تھے دونوں سہ ماہی تھے۔ 'سائنس' اب ماہانہ ہوگیا ہو۔ یہ رسالے جس پایے کے ہیں اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں اور 'سائنس' تو اپنی نظیر آپ ہو۔ ایک کمی تھی جو 'ہماری زبان' کے اجرا سے پوری ہوگئی۔ یہ پندرہ روزہ اخبار بہت مقبول ہوتا جاتا ہو لیکن ضرورت اس امر کی ہو کہ اس کی اشاعت کثرت سے ہو تاکہ پڑھنے والے اپنی زبان کے موافق و مخالف حالات سے باخبر رہیں۔ باخبر رہنا زندگی کا لازمہ اور کام یابی کا پہلا قدم ہو۔

یہ پچھلے تین سال کی مختصر سی رؤداد ہی۔ ہندُستان بھر میں انجمنِ ترقیٔ اُردو ہند ہی ایک ایسا ادارہ ہی جو منظّم طور پر تمام ہندُستان میں اُردو زبان کی خدمت انجام دے رہا ہی اور مختلف مقامات پر اس کی شاخیں اسی اصوُل پر کام کر رہی ہیں۔ شاخوں کی اب ہم از سرِ نو تنظیم کر رہے ہیں۔ انجمن کی ترقّی اور قوتِ باہمی تعاون اور یک جہتی پر ہی۔ اگر ہم نے اپنی کوتہ اندیشی یا کم بینی یا کسی لالچ سے اس اتحاد میں رخنہ پیدا کر دیا تو یاد رکھیے ہماری ساری قوت چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ کر پاش پاش ہو جائے گی۔ اس کے بعد دوبارہ اس قوت کو واپس لانا ناممکن ہو جائے گا۔ اس معاملے میں انجمن اشاعتِ اُردو ناگ پور کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہی کہ اس نے ملک کے حالات اور انجام پر نظر رکھ کر بڑے ایثار سے کام لیا اور اپنی ہستی کو انجمنِ ترقیٔ اُردو ہند میں ضم کر کے اتحاد و تعاون کی بے نظیر مثال پیش کی ہی۔ پھوٹ نے بہت سے گھر گھالے ہیں، عظیم الشان اور جلیل القدر سلطنتوں اور ہونہار اور باکار اداروں کو آن کی آن میں بٹھا دیا ہی ہمیں اس سے خبردار رہنا چاہیے کیوں کہ حریف ہماری تاک میں ہی۔ اگر ہم نے باہمی اتحاد اور کامل جذبے سے یک دل و یک جان، یک رنگ و یک خیال ہو کر اس کام کی بُنیادیں مضبوط کر دیں تو یقین جانیے ہنُدستان کی مشترکہ زبان اُردو ہی ہو کے رہے گی۔

اس کے بعد حضرت مولانا آزاد سبحانی صاحب مدظلہٗ نے اپنے خاص اندازِ بیان اور اپنے مخصوص طرزِ ادا میں اُردو زبان کی اہمیت پر ایک پُر مغز تقریر فرمائی اس کے بعد پہلی نشست ختم ہوئی اور جلسہ برخاست ہوا۔

دوسری نشست

۲۰ر جنوری سنہ ۱۹۴۴ء

مجلس مضامین | ۲۰ جنوری ۱۹۴۴ء کی صبح کو ۹ بجے کانفرنس کی دوسری نشست شروع ہوئی۔ چوں کہ منتخب صدر نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمان صاحب شروانی کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ اس لیے مجلس مضامین کا اجلاس زیرِ صدارت عبدالرحمٰن صاحب صدیقی ایم۔ ایل۔ اے منعقد ہوا۔

مجلس مقالات شعبۂ خواتین | ۲ بجے دن کو بہ مقام انجمن ہائی اسکول ہال مقالات شعبۂ خواتین کی مجلس منعقد ہوئی۔ اس میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے بھی شرکت فرمائی۔

مجلس مقالات (پہلا اجلاس) | ۷ بجے شام کو مجلس مقالات کانفرنس کا پہلا اجلاس زیر صدارت مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی کانفرنس کے پنڈال میں شروع ہوا۔ اس اجلاس میں حسب ذیل حضرات نے مقالے پڑھے۔

علامہ کیفی صاحب۔	اُردو ہندی، ہندستانی
پروفیسر شہاب دیسنوی پرنسپل انجمن اسلام ہائی اسکول بمبئی	بمبئی شہر میں تعلیم بالغان کی تحریک اور اُس میں اُردو کا حصّہ۔
پروفیسر عبدالقیوم باقی۔	ادب جمالیاتی تنقید کی روشنی میں
لکچرر غلام مصطفےٰ صاحب ایم اے کنگ ایڈورڈ کالج امراوتی	تعارف کلیم جبل پوری

عام اجلاس | ۹½ بجے شب کو کانفرنس کا عام اجلاس زیرصدارت جناب عبدالرحمٰن صاحب ایم۔ ایل۔ اے شروع ہوا۔ اور تجاویز پر تقریریں ہوئیں۔

تقریروں کے بعد جناب الیاس برنی صاحب نے اُردو اور ہندی رسم خط پر ایک دل چسپ تقریر فرمائی۔

اسی دن یعنی ۲۰ رجنوری ۱۹۴۴ء کی رات کو ۸ بجے جملہ مہمانان کانفرنس و شعرائے کرام جناب نواب محی الدین خاں صاحب کے دولت کدے پر کھانے پر مدعو تھے جہاں معززین شہر سے اِن کا تعارف کرایا گیا۔

تیسری نشست

۲۱ر جنوری سنہ ۱۹۴۴ء

رسمِ خط کمیٹی ۲۱ر جنوری ۱۹۴۴ء کو حسب اعلان نو بجے صبح کو رسم خط کی ذیلی مجلس کا اجلاس پنڈال میں منعقد ہوا۔ انجمن کی رسم خط کمیٹی کے میر مجلس ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی کوشش کے باوجود ریل کے بروقت الہ آباد سے نہ چلنے کے باعث تشریف نہ لا سکے۔ عبدالرحمٰن صاحب صدیقی ایم۔ ایل۔ اے (کلکتہ) نے صدارت فرمائی۔

انجمن کی کمیٹی نے اس باب میں جو تجاویز اپنے ۲۲ر مارچ ۱۹۴۳ء کے اجلاس میں مرتب کی تھیں وہ یکے بعد دیگرے پیش ہوئیں اور کافی غور و مباحثے کے بعد خفیف ترمیم و اضافے کے ساتھ منظور ہوئیں۔ اس کمیٹی میں حسبِ ذیل حضرات نے شرکت فرمائی۔

(۱) ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب

(۲) سید ہاشمی صاحب فرید آبادی سکریٹری

(۳) مولوی اکرام اللہ خاں صاحب ندوی

(۴) سید احتشام حسین صاحب رضوی ایم۔ اے لکچرار لکھنؤ یونی ورسٹی۔

(۵) ضیاء اللہ خاں صاحب صدر کتب خانۂ رام پور

(۶) ڈاکٹر ابو اللیث صاحب صدیقی لکچرار علی گڑھ یونی ورسٹی

(۷) مولانا عرشی صاحب مہتمم سرکاری کتب خانہ رام پور

(۸) پروفیسر غلام مصطفےٰ خاں صاحب ایم۔اے لکچرار کنگ ایڈورڈ کالج امراؤتی۔

(۹) مولوی احمد علی صاحب ناندیر

(۱۰) مولانا محمد حسین صاحب محوی لکچرار مدراس یونی ورسٹی

(۱۱) حکیم اسرار احمد صاحب

(۱۲) وحید اللہ صاحب بی۔اے۔اِل ٹی۔اٹارسی

(۱۳) وقار واثق صاحب مئو چھاؤنی۔

(۱۴) ڈاکٹر عاشق حسین صاحب بٹالوی ایم۔اے، ال ال بی۔پی۔ایچ۔ڈی

(۱۵) جناب پروفیسر شہاب ولینوی بمبئی۔

(۱۶) عبدالباقی صاحب ایم۔اے

(۱۷) ماہر القادری صاحب۔بمبئی

(۱۸) اکرام الدین صاحب کاظمی ایم۔اے

(۱۹) مولانا عطا حسین صاحب

تجاویز ملخصاً درج ذیل ہیں :-

۱۔کتابت اور خاص کر چھاپے میں دو لفظوں کے درمیان واضح فصل چھوڑا جائے۔ایک لفظ کے اوپر دوسرا لفظ نہ لکھا جائے۔مرکب الفاظ کو ملا کر نہ لکھا جائے جیسے :- آج کل، کل جُگ، گُل کاری وغیرہ۔اسی طرح ایسے مفرد الفاظ بھی جو دونوں طرح لکھے جاتے ہیں، آیندہ منفصل ہی لکھے جائیں۔جیسے :- بی بی،

جھٹ پٹا، جھن جھناہٹ، ہل چل وغیرہ۔ اور فارسی حروف بہ، نہ، چہ وغیرہ کو بھی ملا کر نہ لکھا جائے بلکہ علاحدہ تحریر کیا جائے۔ جیسے بہ خوبی، بہ ہر حال چناں چہ وغیرہ۔

۲۔ ہمزہ جب کسی منفصل حرف کے بعد آئے تو جداگانہ لکھا جائے اور اس کے لیے کوئی شوشہ نہ بنایا جائے۔ جیسے آری، ناری، سارل، گھارل وغیرہ۔

(ایک گروہ کی رائے میں جہاں آسانی سے ممکن ہو وہاں ہمزہ کی بجائے حرفِ الف ہی سے کام لیا جائے جیسے :- عزرائیل، سارایس وغیرہ۔)

۳۔ دھ، ڈھ، رھ، ڑھ کو لکھنے میں ہائے مخلوط کو اصل حرف سے ملا کر لکھا جائے۔ یعنی دھ، رھ، ڑھ اور اصل حرف کی مثل انھیں بھی حرفِ منفصل قرار دیا جائے اور دو چشمی ھ کو لفظ کے دوسرے ٹکڑوں سے ملانے کی بجائے حسب ذیل طریقے پر لکھا جائے :- دھن (بجائے دھن) دھرتی (بجائے دھرتی) پڑھنا (بجائے پڑھنا)

(حرف ی اور نون غنّہ کے متعلق کمیٹی کی پہلی تجاویز مسترد کر دی گئیں اور قرار پایا کہ اس کی موجودہ کتابت جو انجمنِ ترقی اُردو نے اختیار کی ہے، برقرار رکھی جائے۔)

۴۔ عربی کے حروف اِن، مِن وغیرہ علاحدہ لکھے جائیں، جیسے :- اِن شاء اللہ، لیکن آگے عربی ضمیر آنے کی صورت میں ملا کر تحریر ہوں جیسے: عنہم، منہم۔

۵۔ عربی حرفِ تعریف اَل کا الف یا لام جہاں ساکت ہوں وہاں اُن کے اوپر چھوٹا خط بنا دیا جائے۔ جیسے السلام اور علیکم السلام۔

۶۔ عربی ناموں اور عام الفاظ میں الفِ مقصورہ کی بجائے پورا الف لکھا جائے جیسے :- ابراہیم، سلیمان، حیات، ریا اور اعلا، ادنا، مولانا وغیرہ۔

۷-غیر زبان کے الفاظ کو الگ الگ ٹکڑوں میں لکھا جائے۔ جیسے :- اِنس پک ٹر، ڈاک ٹر، یونی ورسٹی، انس ٹی ٹیوٹ، ڈپارٹ منٹ وغیرہ۔ لیکن حروف متصل جب شروع میں آئیں تو ایک رُکن ہونے کے باوجود انھیں جُدا نہ لکھا جائے (جیسے: مسٹر کاہم ہی)۔

۸-صرف ابتدائی تعلیم کی حد تک کمیٹی نے یہ تجویز بھی قبول کی کہ علاماتِ مصدر یا ماضی وحال، اصل مادّے سے جُدا لکھے جائیں، جیسے : لِکھ نا، لِکھ تے ہمجھ نا وغیرہ۔

(ب) دوسرے یہ کہ ان ابتدائی کتابوں میں ہر لفظ کے ایک ایک رُکن کو جدا کر کے لکھا جائے۔ لیکن شروع میں حرف متصل ہو تو اُسے ملا کر ہی لکھا جائے گا جیسے: مُصی بت، قری نہ۔ وغیرہ الفاظ ہیں۔

۹-ایک اہم تجویز یہ منظور ہوئی کہ اعرابی یؔ کو الف اور وآو کی مثل حرف منفصل قرار دیا جائے اور اس کی مجہول، معرُوف اور ماقبلِ مفتوح شکلوں کی کتابت وہی رہے جو انجمن نے اختیار کر رکھی ہی جیسے : بیٓ ر (مشہور پھل) بِی ر (بہ معنی بھائی) اور بَی ر (بہ معنی دشمنی)

۱۰-ایک اور اہم قرار داد یہ کی گئی کہ اصل تجاویز (مرتّبہ راقم حروف) کی دفعہ پانچ کو از سرِ نو رائے کے لیے اخبار "ہماری زبان" میں شائع کیا جائے کیوں کہ کمیٹی کی رائے میں اس قسم کی اصلاح ضرُوری ہوتی جاتی ہی۔ یہ تجویز حسبِ ذیل ہی:-

عربی کے ہم آواز حروف جن کی تین اور چار شکلیں آتی ہیں، ان کو اُردو تحریر میں گھٹا کر صرف دو شکلوں پہ اکتفا کرنا جائز قرار دیا جائے۔ یعنی :-

ث - س - ص میں سے ص کو اور ز، ذ، ض، ظ میں سے ض اور ز کو حذف کر دیا جائے یا جو لوگ ان کی بجائے س اور ذ، ظ سے کام لیں اُن پر حرف گیری نہ کی جائے۔ ایسے حروف کی باقی تین قسمیں یعنی (ا، ع ÷ ت، ط

اور ح، ہ) بدستور رہیں گی۔

اس آخری تجویز کی نسبت ہماری استدعا ہے کہ ناظرین اخبار اور دیگر اہلِ الرائے حضرات ہمیں اپنی رائے سے مستفید فرمائیں۔

شعبۂ خواتین کا عام اجلاس اس شعبے کے تحت خواتین کا اجلاس ۳ بجے دن کو کانفرنس کے پنڈال میں منعقد کیا گیا۔ جلسے کی صدارت صوبے کی مایۂ ناز ادیب پروفیسر خورشید آرا بیگم (منشی فاضل) نے فرمائی۔ اِس اجلاس میں شہر و صوبے کی ادب نواز خواتین نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ مگر اس ادبی جلسے میں بیرونِ صوبہ کی خواتین سفر کی دشواریوں کے باعث شریک نہ ہوسکیں۔

جلسے کی ابتدا طلعت شہبانہ بانو کی ایک نظم بہ عنوان "بے داریٔ نسواں" سے ہوئی جسے بہت پسند کیا گیا۔

بیگم سمیع اللہ خاں صاحب ایڈوکیٹ نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں ارشاد فرمایا "ہمارے اس اجتماع کا مقصد نہ تو کسی سیاسی تحریک کا مرہونِ منت ہے اور نہ کسی مذہبی جذبے کے زیرِ اثر بلکہ ہم صرف اس لیے جمع ہوئے ہیں کہ کس طرح مخالفین اُردو کی شاطرانہ و تعصبانہ چالوں سے اپنی پیاری زبان اُردو کو بچائیں اور اس کی ترویج و ترقی کے لیے کیا کیا صورتیں اختیار کریں"۔ آپ نے مشورہ دیا کہ "خواتین کے ادبی اداروں کو انجمن ترقیٔ اُردو سے تعاون کرلینا چاہیے اور ایک مرکزی نظام کے تحت کام کرنا چاہیے"۔

خطبۂ استقبالیہ کے بعد صدر صاحبہ نے اپنا پُرمغز دپُراز معلومات خطبۂ صدارت زبانی ارشاد فرمایا جو ادبی شان رکھتا تھا اور معلومات کا خزینہ تھا۔

اس کے بعد بیگم یار محمد خاں صاحب نے بہ عنوان "اُردو زبان" اور اقبال النسا بیگم صاحبہ قادریہ نے "اُردو ہندستان کی عام زبان بننے کی صلاحیت رکھتی ہے"

کے عنوان پر تقریریں کیں۔

شعبۂ نسواں کی دعوت پر بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب جلسۂ خواتین میں تشریف لائے۔ اور محترمہ بیگم بغدادی صاحبہ نے بہ عنوان "بابائے اُردو" ایک نظم پڑھی جسے خواتین نے بے حد پسند کیا۔

ڈاکٹر صاحب نے عدیم الفرصتی کے باعث ایک مختصر مگر جامع تقریر فرمائی اس کے بعد انیس فاطمہ صاحبہ نے اُردو زبان پر تقریر کی اور ظفر بانو صاحبہ نے مقالہ بہ عنوان " اُردو اور آزاد " پڑھا۔ بیگم محمود الحسن صدیقی نے " اُردو کی ترقی میں عورتوں کا حصّہ " کے عنوان سے ایک تقریر کی۔ آخر میں ذیل کی تجاویز باتفاق رائے پاس ہوئیں:۔

(۱) خواتین انجمن ترقیٔ اُردو کانفرنس کا یہ جلسہ اکثر ہندُستانی جامعات کے امتحانات السنۂ شرقیہ میں اُردو کو جگہ نہ دینے پر صدائے احتجاج بلند کرتا ہے اور جامعہ ناگ پور کو توجّہ دلاتا ہے کہ وہ مذکورہ امتحانات میں اُردو کو شامل کرے۔

(۲) سی۔پی اور برار کی مُسلم خواتین تعلیم میں بہت پیچھے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہاں مدارس کا انتظام کافی نہیں ہے۔ گورمنٹ کی طرف سے ایک بھی اُردو ہائی اسکول نہیں ہے۔ اس کے مقابلے میں مرہٹی جاننے والی لڑکیوں کے لیے اکولہ وغیرہ میں ہائی اسکول موجود ہیں۔ اس لیے اُردو کانفرنس کا یہ اجلاس گورمنٹ سے پُر زور مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ناگ پور میں ایک ہائی اسکول اُردو جاننے والی لڑکیوں کے لیے کھولے یا موجودہ اینگلو اردو گرلس اسکول صدر بازار کا انتظام اپنے ذمّے لے۔

(۳) چوں کہ سی پی و برار میں اُردو جاننے والی لڑکیوں کے لیے کوئی نارمل اسکول نہیں ہے اس وجہ سے لڑکیوں کو ٹریننگ کے لیے سخت دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جبل پور نارمل اسکول میں جو انتظام کیا گیا ہے وہ اطمینان بخش نہیں ہے۔

اس لیے یہ جلسہ تجویز کرتا ہو کہ گورمنٹ کو اُردُو جاننے والی لڑکیوں کے لیے ناگ پور میں نارمل اسکول کھولنا چاہیے۔

۷ بجے شام کو یہ اجلاس پوری کام یابی کے ساتھ ختم ہوا۔

مجلسِ مقالات (دُوسرا اجلاس)

مجلسِ مقالات کا دُوسرا اجلاس ۳ بجے دن کو بہ مقام انجمن ہائی اسکول ہال منعقد ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت جناب عبدالرحمان صاحب صدیقی ایم۔ایل۔اے (کلکتہ) نے فرمائی۔ اس مجلس میں حسبِ ذیل مقالے پڑھے گئے:-

(۱) اُردُو مثنوی کا ارتقا ——— جناب ڈاکٹر ابواللیث صاحب صدیقی ایم۔اے لکچرر مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ۔

(۲) ترقی پسند ادب کی ترویج ——— عبادت صاحب بریلوی ایم۔اے

(۳) تحفظ زبان کے مسئلے پر چند خیالات۔ احتشام حسین صاحب رضوی ایم۔اے لکچرر لکھنؤ یونی ورسٹی

(۴) شمال کی پہلی تاریخی یورش دکن پر۔ سیّد ہاشمی صاحب فرید آبادی

(۵) اُردُو خطوط نویسی کا ماضی وحال۔ ثاقب صاحب رزمی

۲۱ر جنوری کی شام کو ۵ بجے نواب صدیق علی خاں صاحب ایم ایل اے نے مہمانانِ کانفرنس اور محکمۂ تعلیمات و ناگپور یونی ورسٹی کے بعض ذمّے دار اصحاب کو اپنے ہاں چائے پر مدعو کیا جہاں صوبے میں اُردُو کی ترویج و ترقی کے بارے میں باہمی تبادلۂ خیال ہوا۔ پھر اسی دن رات کو ۸ بجے حاجی عبدالغنی صاحب رئیس ناگ پور اور اُن کے احباب نے کانفرنس اور معزّزین شہر کو ماؤنٹ ہوٹل ناگ پور میں شان دار ڈنر دیا۔ یہاں بھی باہمی گفتگو میں

اُردو کی ترقی ہی کا مسئلہ موضوع رہا۔

عام اجلاس کانفرنس کی تیسری نشست کا عام اجلاس ۲۱ رجنوری کی رات کو ½ ۹ بجے زیر صدارت عبدالرحمان صاحب صدیقی ایم ایل اے (کلکتہ) شروع ہوا۔ اس اجلاس میں ان تجاویز پر تقریریں ہوئیں جو پچھلے دن کے اجلاس میں باقی رہ گئی تھیں۔ اِس کے بعد آقا سید محمد حجازی نمائندہ فرہنگستان ایران نے فارسی زبان میں ایک برمحل تقریر فرمائی۔ آپ نے کہا کہ ایران کے علمی طبقے کی یہ دلی خواہش ہے کہ ایران اور ہندستان کے تعلقات میں خوش گوار استواری پیدا ہو۔ ہمارے اکثر ہندُستانی بھائی یورپ اور امریکہ میں تعلیم حاصل کرنے جاتے ہیں یہ بہت اچھی بات ہے لیکن اسی کے ساتھ انھیں اپنے ہمسایہ ملک ایران کو نہ بھولنا چاہیے جو دو ہزار سالہ ادب کا خزانہ رکھتا ہے۔ موصوف نے کہا کہ مجھ سے ہندستان میں فارسی زبان کے متعلق بہت سے سوالات کیے گئے ہیں میں انھیں بتلانا چاہتا ہوں کہ ایران میں آج بھی وہی آسان اور شیریں فارسی بولی جاتی ہے جو کبھی سعدی اور حافظ شیرازی کے زمانے میں بولی جاتی تھی۔ آپ نے قدیم اور جدید فارسی ادب کا کچھ کلام بھی نمونتاً سُنایا۔ اور حاضرین کو یقین دلایا کہ اگر آپ نے آج سے فارسی زبان سیکھنی شروع کر دی تو دو سال میں آپ اچھی فارسی سمجھنے لگیں گے۔ اور میں امید کرتا ہوں کہ دو سال بعد جب میں ہندستان آؤں گا تو آپ صاحبان میری زبان کو بہ آسانی سمجھ لیں گے۔

جناب صدر نے آپ کی تقریر کا خلاصہ اُردو میں سُنایا۔

منظور شدہ تجویزیں

تجویز ۱ - کُل ہند اُردو کانفرنس کا یہ اجلاس مہاراجا کشن پرشاد شاد۔ راجا

دیاکشن صاحب کول، منشی دیا نرائن نگم صاحب، مولانا شوکت علی خاں فانی بدایونی پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی، منشی اقبال ورما سحر، مولوی عنایت اللہ دہلوی، مرزا عظیم بیگ چغتائی، قمرالحسن صاحب قمر بدایونی، سید سجاد حیدر یلدرم اور مولوی محفوظ علی صاحب بدایونی کی وفات پر انتہائی الم و تاسف کا اظہار کرتے ہوئے ان کے پس ماندگان سے ہم دردی کرتا ہے۔

تجویز ۲ ۔ اس کانفرنس کی رائے ہے کہ اُردو کی مقبولیت اور صلاحیت کے پیشِ نظر اور نیز اس کی افادیت کو مزید مؤثر بنانے کے لیے اس امر کی ضرورت ہے کہ برطانوی ہند کے کسی مرکزی مقام پر ایک اُردو یونی ورسٹی قائم کی جائے اور انجمن ترقی اُردو ہند سے درخواست ہے کہ وہ اُس کے قیام کے امکانات پر غور و خوض کرے اور اس سلسلے میں ابتدائی تدابیر عمل میں لائے۔

تجویز ۳ ۔ انجمن ترقی اُردو ہند کا یہ اجلاس محکمۂ ڈاک حکومتِ ہند سے درخواست کرتا ہے کہ محکمۂ ڈاک کے اِن ملازمین کے لیے (بہ شمول شعبۂ ریلوے میل سروس) جن کا تعلق خطوط کی تقسیم سے ہے مقامی اور صوبائی زبانوں کے علاوہ اُردو زبان و رسمِ خط کا جاننا ضروری و لازمی قرار دیا جائے۔

تجویز ۴ ۔ ریاست جے پور کی موجودہ وزارت کے دور میں جے پور سے اُردو کو جلا وطن کرنے کی جس ناروا مہم کا آغاز کیا گیا ہے یہ اجلاس اس پر اپنے دلی رنج و تاسف کا اظہار کرتا ہے اور وزیرِ اعظم جے پور اور اُن کی وساطت سے دربارِ جے پور پر یہ واضح کر دینا چاہتا ہے کہ زبانِ اُردو کے خلاف جے پور میں جو پالیسی اختیار کی گئی ہے وہ نہ صرف جے پور بلکہ پورے ملک کی یک جہتی اور باہمی روابط پر کاری ضرب ہے۔

تجویز ۵ ۔ کُل ہند اُردو کانفرنس کا یہ اجلاس حکومت صوبۂ بہار اور پٹنہ

یونی ورسٹی کے اس طرزِ عمل کے خلاف جو ہندستانی کے پردے میں اور اس نام سے ایک مصنوعی نامانوس زبان کو رائج کرنے کی کوشش پر مبنی ہی اپنی بےزاری کا اعلان کرتا ہی۔کانفرنس کی رائے میں اس قسم کا اقدام ملک و قوم کے لیے سخت مضر ثابت ہوگا۔

تجویز ۶ ۔کُل ہند اُردو کانفرنس کا یہ اجلاس اُردو نیوز سروس (حیدرآباد دکن) کی خدمات کو بہ نظر استحسان دیکھتا ہی اور مُلک کے جملہ حامیان و محبانِ اُردو سے اس کام میں مکمل اشتراک و تعاون کی درخواست کرتا ہی اور اردو اخبارات کے "نیوز بلیٹن" کی اشاعت اُردو صحافت کے لیے بہت مفید خیال کرتا ہی۔

تجویز ۷ ۔کانفرنس ہذا کا یہ اجلاس نہایت رنج و افسوس کے ساتھ اس امر کو محسوس کرتا ہی کہ اگرچہ کشمیر اور اہل کشمیر کو ہندی سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہی۔ پھر بھی دربارِ کشمیر نے اُسے خواہ مخواہ اُردو کے حریف کی حیثیت سے کشمیر میں رائج کرنے کے احکام جاری کر دیے ہیں، یہ کانفرنس دربارِ کشمیر کے اس نامناسب اقدام کو تعلیمی اور لسانی حیثیت سے نہایت مُضر قرار دیتی ہی اور رعایاے کشمیر کے باہمی تعلقات کے حق میں بےحد مخدوش سمجھتی ہی۔کانفرنس ہذا دربارِ کشمیر سے مستدعی ہی کہ جس قدر جلد ممکن ہو اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرکے ان احکامات کو منسوخ کرے۔

تجویز ۸ ۔یہ کانفرنس انجمنِ ترقیِ اُردو ہند سے درخواست کرتی ہی کہ اردو دانوں کی عام ضرورت اور خواہش کا لحاظ کرتے ہوئے اپنی نگرانی میں اُردو کے معیاری امتحانات کا انتظام کرے۔

تجویز ۹ ۔کل ہند اُردو کانفرنس اس امر پر اظہارِ مسرت کرتی ہی کہ آگرہ اور دہلی یونی ورسٹی کے ایم۔اے کے لیے اُردو کی تعلیم کا مناسب انتظام ہوگیا

ہی اور میسور میں اُردو کی چیئر قائم ہوئی ہے۔ لیکن اس کانفرنس کی رائے میں یہ امر قابلِ افسوس ہے کہ ابھی تک ہندستان کی اکثر یونی ورسٹیوں میں دوسرے مضامین کے مساوی درجہ اُسے حاصل نہیں اس لیے کانفرنس کی رائے میں یہ ضروری ہے کہ اُردو کی اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ، ناگ پور، پنجاب، آگرہ، دہلی، لکھنؤ میں اُردو کی چیئر قائم کی جائے اور ان یونی ورسٹیوں کے اربابِ حل وعقد اس طرف متوجہ ہوں۔

(۲) اگرچہ یونی ورسٹی بورڈ ایجوکیشن اور مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں ہائی اسکول اور انٹرمیجیٹ میں اُردو کو ذریعۂ امتحان تسلیم کرلیا گیا ہے لیکن اُردو میں مختلف علوم وفنون کی متعلقہ کتابوں کے ترجمے اور تصنیف کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ چناں چہ اس کانفرنس کی رائے میں یہ گورمنٹ کا فرض ہے کہ وہ فی الحال کم از کم ہائی اسکول اور انٹرمیجیٹ کے لیے اُردو میں علمی اور فنی کتابیں تصنیف اور ترجمہ کرانے کا مستقل بندوبست کرے۔

(۳) مُلک میں اُردو کی پُرانی اور اہم کتابیں جن میں سے اکثر نادر اور نایاب ہیں جس کس مپرسی کے عالم میں ہیں اس کے پیشِ نظر اس کانفرنس کی رائے میں انجمن کو کتابوں کے جائزے کا کام کرنا چاہیے تاکہ پبلک اور ذاتی لائبریریوں میں موجودہ کتابوں کی ایک مکمل اور جامع فہرست مرتب ہو جائے اور تحقیق کرنے والوں کو اس نشان دہی سے سہولت ہو اور جو کتابیں انجمن کو مل سکیں وہ لائبریری میں محفوظ کردی جائیں۔

تجویز ۱۰ - ہرگاہ کہ پنجاب میں حکومت کے جملہ شعبوں یعنی عدالت ہائے دیوانی وفوج داری، محکمۂ مال گزاری محکمۂ پولس، محکمہ پنچایت وغیرہ میں سرکاری اور دفتری کارروائی اُردو میں ہوتی ہے اور غیر سرکاری طور پر بھی، یہ شرف صوبۂ پنجاب ہی کو حاصل ہے کہ وہ ہندستان بھر میں اُردو صحافت اور مطبوعات کی اشاعت کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ یہ کانفرنس اس بات پر سخت تاسف کا اظہار کرتی ہے کہ اِن حقائق

کے باوجود اب تک نہ حکومتِ پنجاب نے اور نہ پنجاب یونی ورسٹی نے درسی اعتبار سے اُردو کو وہ حیثیت دی ہے جو اسے صوبے کی واحد قومی زبان ہونے کی رُو سے صوبے کی تمام درس گاہوں میں حاصل ہونی چاہیے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے یہ کانفرنس حکومتِ پنجاب سے پُرزور مطالبہ کرتی ہے کہ وہ مزید وقت ضائع کیے بغیر فوراً اس امر کا مکمل اور خاطر خواہ انتظام کرے کہ تمام مردانہ اور زنانہ مدارس میں پہلی جماعت سے لے کر دسویں جماعت تک جملہ مضامین کی تعلیم اُردو میں ہو۔

(ب) اس غرض کے لیے یہ کانفرنس نہایت پُرزور الفاظ میں پنجاب یونی ورسٹی سے بھی مطالبہ کرتی ہے کہ وہ جلد از جلد ذیل کے انتظامات عمل میں لائے:۔

(۱) میٹریکولیشن کے امتحان کے امیدوار انگریزی کے پرچے کے علاوہ باقی تمام مضامین کے پرچے اُردو میں حاصل کریں۔ نیز میٹرک میں اُردو زبان کو انگریزی اور حساب کی طرح لازمی مضمون قرار دیا جائے۔

(۲) ایف۔ اے اور بی۔ اے کے امتحانات میں اُردو کے پرچے کے نمبر دیگر مضامین کے پرچوں کے نمبروں کے برابر مقرر کر کے اُسے ایک مکمل اختیاری مضمون بنا دے جس میں پاس ہونا لازمی ہو۔

(۳) اُردو زبان اور ادب میں ایم۔ اے کا امتحان مقرر کرے۔

(۴) دُوسرے مضامین کے بورڈ آف اسٹڈیز کی طرح اُردو کا بھی ایک بورڈ قائم کرے۔

تجویز ۱۱۔ صوبۂ متوسط و برار میں اُردو تعلیم کے نظام بہتر بنانے کے لیے کُل ہند انجمنِ ترقیٔ اُردو کانفرنس کا یہ اجلاس محکمۂ تعلیم صوبۂ متوسط و برار سے حسبِ ذیل مطالبات کرتا ہے:۔

(۱) اُردو کی ابتدائی تعلیم کا نظم و نسق حکومت براہِ راست اسی طرح اپنے ہاتھ میں لے جیسا کہ وہ یورپین اور اینگلو انڈین ابتدائی مدرسوں کا انتظام کرتی ہے۔

(۲) اُردُو مدارس کے اساتذہ کو دفتر میں مراسلت کے لیے اُردُو زبان و رسمِ خط کی اجازت دی جائے۔

(۳) ناگ پور میں اُردُو معلمات کی ٹریننگ کے لیے جولائی سنہ ۱۹۴۶ء سے ایک نارمل اسکول کھولا جائے۔

(۴) صوبے کے ہائی اسکولوں میں ایک سے زیادہ ذریعہ ہائے تعلیم کی اجازت منسوخ کی جائے اور اس سلسلے میں ہائی اسکول ایجوکیشن بورڈ کے فیصلے کو مُسترد کر دیا جائے۔

(۵) محکمۂ تعلیمات کے ایڈمنسٹریٹو افیسرس کے لیے مرہٹی اور ہندی کے ساتھ اُردُو زبان و رسمِ خط کا جاننا بھی لازمی قرار دیا جائے۔

(۶) جس طرح اُردُو نارمل اسکول امراؤتی میں ضمنی طور پر مرہٹی زبان سکھائی جاتی ہے اسی طرح مرہٹی نارمل اسکول میں بھی اُردُو کی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

(۷) گورنمنٹ ہائی اسکول کھنڈوہ کے داخلے میں اُردُو ذریعۂ تعلیم سے کام یاب شدہ طلبا کا خاص طور سے خیال کیا جائے۔

(۸) گورنمنٹ ہائی اسکول ساگر میں جولائی سنہ ۱۹۴۶ء سے اُردُو کے چار سکشن کھولے جائیں۔

(۹) میونسپل مڈل اسکول بالاگھاٹ کو اُردُو ذریعۂ تعلیم کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔

(۱۰) ایک طے شدہ پالیسی کے تحت حکومت نیز لوکل سیلف گورنمنٹ کے اداروں کے زیرِ انتظام صوبے کے ہر مڈل اور ہائی اسکول میں اُردُو تعلیم کا مناسب اور معقول انتظام کیا جائے۔

(۱۱) گورنمنٹ ہائی اسکول رائے پور میں اُردُو کی تعلیم کا انتظام بہ دستور باقی رکھا جائے۔

(۱۲) حکومت جس طرح مرہٹی کے ایک ماہ نامے "برار شالا پترک" کو اٹھارہ سو رُپے

سالانہ امداد دیتی ہے۔ اسی طرح رسالہ "بہارستان" امراؤتی کو بھی جو پندرہ سال سے تعلیمی خدمات انجام دے رہا ہے۔ معقول اور مناسب امداد دی جائے۔

(۱۳) ساگر میں طالبات کے لیے اُردو ذریعۂ تعلیم کے ساتھ ایک مڈل اسکول کھولا جائے۔

(۱۴) انجمن نورالاسلام ہائی اسکول اٹارسی کو جس کا ذریعۂ تعلیم اُردو ہے رکگنائز کیا جائے اور معقول امداد دی جائے۔

(۱۵) صوبے کے بعض ڈسٹرکٹ کونسلوں کے زیرِ انتظام ابتدائی مدرسوں میں اُردو کی تعلیم کے لیے اسکول ختم ہونے کے بعد جو ایک گھنٹہ رکھا گیا ہے وہ قطعی ناکافی ہے اور اس سے اُردو پڑھنے والے طلبا کو فائدہ پہنچنے کے بجائے نقصان پہنچتا ہے اس لیے اُردو کے ابتدائی مدرسے حسبِ ضرورت جداگانہ طور پر کھولے جائیں۔

(۱۶) جو طلبا ابتدائی مدرسوں سے اُردو ذریعۂ تعلیم سے فارغ ہوتے ہیں۔ ان کی ثانوی تعلیم کا انتظام لازمی طور پر اُردو ذریعۂ تعلیم سے کیا جائے۔

(۱۷) جن مدارس میں طلبا کو ایک ساتھ اُردو اور ہندی زبانوں میں تعلیم دی جاتی ہے ان میں اُردو ذریعۂ تعلیم سے پڑھنے والے طلبا کو نصاب کی ہندی کتابیں خریدنے پر مجبور نہ کیا جائے اور مدرسین کو ہدایت کی جائے کہ انھیں اُردو کتابوں کے ذریعے تعلیم دیں۔

(۱۸) بورسٹل انسٹی ٹیوٹ نرسنگھ پور میں اُردو زبان و رسم خط کی تعلیم کا مناسب انتظام کیا جائے۔

(ب) طے پایا کہ مذکورہ بالا تجاویز کو حکومت تک پہنچانے کے لیے حسبِ ذیل حضرات کا ایک وفد مقرر کیا جائے۔ جو کانفرنس کے ختم ہونے کے ایک مہینے کے اندر انھیں متعلقہ حکام کی خدمت میں پیش کر دے۔ اس وفد کو یہ بھی اختیار دیا جاتا ہے

کہ مذکورہ بالا امور کے علاوہ اور جن باتوں کو اُردو کی ترقی و تحفظ اور اشاعت کے لیے
ضروری سمجھے پیش کرے۔

(۱) نواب صدیق علی خاں صاحب ایم-ایل-اے مرکزی صدر
(۲) نواب محی الدین خاں صاحب ایم-ایل-اے
(۳) مولانا مفتی بُرہان الحق صاحب۔
(۴) قاضی علاؤالدین صاحب ایم-اے-ایل-ایل-بی امراؤتی۔
(۵) محمد حامد صاحب بی-اے سابق تحصیل دار رائے پور
(۶) جناب عبدالہادی صاحب وائس پریسیڈنٹ میونسپل کمیٹی جبل پور
(۷) جناب سمیع اللہ خاں صاحب وائس پریسیڈنٹ ناگ پور میونسپلٹی۔

اس کمیٹی کے داعی جناب سمیع اللہ خاں صاحب مقرر ہوئے۔

(۱۹) مجوزہ مہاراشٹر یونی ورسٹی کی تشکیل میں مہاراشٹر یونی ورسٹی کمیٹی نے
ہٹی کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا ہی۔ یہ کانفرنس کمیٹی کی اس سفارش کو اُردو داں طبقے
ی تعلیم و تہذیب کے حق میں سخت مضر خیال کرتی ہی اور حکومت بمبئی سے جو صوبے
کے تمام طبقوں کی امین ہی درخواست کرتی ہی کہ اگر دیسی زبان ہی کو ذریعۂ تعلیم
انا مقصود ہی تو ہندستانی
(اُردو) کو بوجہ اِس کے کہ وہ ملک میں لنگوا فرینکا کی حیثیت اختیار کر چکی ہی،
ذریعۂ تعلیم ہونے کا حق ہی۔ اور اگر گورنمنٹ خاص وجوہ سے اس کو عمل میں لانے
سے قاصر ہو تو اُردو داں طبقے کے لیے ذریعۂ تعلیم کے معاملے میں وہی حق ملحوظ
کھا جائے، جو مرہٹی داں آبادی کے لیے کمیٹی نے تجویز کیا ہی۔

بزمِ مشاعرہ

زیرِ صدارت جناب سیّد ہاشمی صاحب فرید آبادی

۱۳ر جنوری ۱۹۴۶ء کی شب کو ۱۱ بجے بزمِ مشاعرہ کا آغاز ہوا۔ جو صبح ۵ بجے تک مسلسل نہایت ہی پُرسکون طور پر اپنی پوری دل چسپیوں کے ساتھ جاری رہا۔

مصرعۂ طرح ؎ جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہیں مےخانہ بنے

" ؎ یہ ستم اور بے مروّت کس سے دیکھا جائے ہے۔

قابلِ ذکر حسبِ ذیل شعرائے کرام نے شرکت فرمائی :۔

(۱) پروفیسر احتشام لکھنوی (۲) عبادت بریلوی (۳) خمار بارہ بنکوی (۴) اختر شیرانی (۵) ماہر القادری (۶) بہار کوٹی (۷) قیسی رام پوری (۸) سروش اورنگ آبادی (۹) آغاز برہان پوری (۱۰) راشد برہان پوری (۱۱) مجنوں جبل پوری (۱۲) مدنی رائے پوری (۱۳) نظیر حیدرآبادی (۱۴) شیدا خورجوی (۱۵) پروفیسر عبدالقیوم باقی حیدرآبادی (۱۶) اثر صدیقی (۱۷) تحسین سروری (۱۸) سلیمان ادیب حیدرآبادی (۱۹) اختر شاہ (۲۰) عزیز سلونوی (۲۱) مولانا محوی لکھنوی (۲۲) علامہ کیفی دہلوی (۲۳) صابر دہلوی (۲۴) ظریف دہلوی (۲۵) امامی بنگلوری (۲۶) شرف امراوتی (۲۷) شعری بھوپالی۔ (۲۸) تربد اکبر آبادی

ان شعرا کے علاوہ دیگر مقامی ممتاز شعرا نے بھی اپنے کلام سُنائے۔

مشاعرہ ختم ہونے کے بعد ناچیز خادم نے بہ حیثیت سکریٹری مجلسِ استقبالیہ مہمانان و شعرائے کرام و نمایندگانِ صوبہ و شرکائے کانفرنس اور جواں ہمت رضاکاروں کا شکریہ ادا کیا۔

فہرستِ مہمانانِ کُل ہند انجمنِ ترقّیٔ اُردو کانفرنس

(صوبہ متوسط و برار کے نمایندوں اور شاعروں کے علاوہ)

یو پی :- (۱) سید احتشام حسین صاحب رضوی پروفیسر لکھنؤ یونی ورسٹی ۔

(۲) عبادت یار خاں صاحب ایم اے بریلوی ۔

(۳) نسیم احمد صاحب منیجر دانش محل لکھنؤ

(۴) ڈاکٹر ابواللیث صاحب صدیقی پروفیسر مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ ۔

(۵) مولانا حامد علی صاحب ندوی (لکھنؤ)

(۶) خمار صاحب (بارہ بنکی)

(۷) نہال احمد صاحب ۔

(۸) اکرام اللہ خاں صاحب ندوی ۔

(۹) مولانا آزاد صاحب سبحانی ۔

(۱۰) امتیاز علی صاحب عرشی رام پوری

(۱۱) ضیاء اللہ صاحب صدر کتب خانہ صولتیہ رام پور ۔

دہلی : (۱) سید ہاشمی صاحب فرید آبادی

(۲) ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب

(۳) علامہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی ۔

(۴) شیدا خورجوی ۔

(۵) جناب اخلاق صاحب معتمد اُردو کالج دہلی

(۶) صابر دہلوی

(۷) ظریف دہلوی

(۸) ستر بد اکبر آبادی

(۱) سید صلاح الدین صاحب جمالی منیجر انجمن ترقی اُردو (ہند)

حیدرآباد: (۱) سروش اورنگ آبادی

(۲) نظیر حیدرآبادی

(۳) جعفر حسین صاحب نمائندہ اُردو نیوز سروس حیدرآباد دکن۔

(۴) پروفیسر عبدالقیوم صاحب باقی عثمانیہ یونی ورسٹی۔

(۵) نواب معشوق یار جنگ صاحب

(۶) نواب منظور یار جنگ صاحب۔

(۷) حکیم محمد یوسف صاحب نیر

(۸) مولوی سید عطا حسین صاحب سابق ناظم تعمیرات حیدرآباد دکن۔

(۹) عبدالرحیم خاں صاحب قیسی (اورنگ آباد)

(۱۰) منشی محمد علی صاحب منتظم عثمانیہ کالج اورنگ آباد۔

(۱۱) سروش صاحب لکچرار ″

(۱۲) قریشی صاحب مددگار منتظم ″

(۱۳) مولوی سید احمد علی صاحب (ناندیڑ)

(۱۴) نواب صدر یار جنگ صاحب مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی۔

(۱۵) مولانا الیاس صاحب برنی مہتمم دارالترجمہ سرکارِ عالی۔

(۱۶) ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی پروفیسر ریاضیات عثمانیہ یونی ورسٹی۔

(۱۷) سید تقی الدین صاحب نائب معتمد محکمۂ دستوری

(۱۸) کرم اللہ صاحب شعبۂ معتمدی محکمۂ امورِ دستوری

ٹونک:۔ (۱) اختر شیرانی

میسور: (۱) حکیم امامی صاحب بنگلوری

بھوپال: (۱) شعری صاحب بھوپالی

مدراس: (۱) مولانا محمد حسین صاحب محوی

(۲) سید سلطان محی الدین بہمنی صاحب مدراس

(۳) سیٹھ عبدالجمیل صاحب صدر انجمن ترقیِ اُردو، سیل دشارم

(۴) محمود حسین صاحب بی، اے۔

بمبئی: (۱) ماہرالقادری

(۲) پروفیسر شہاب دیسنوی پرنسپل انجمن اسلام ہائی اسکول بمبئی۔

(۳) پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی اندھیری کالج بمبئی۔

اجمیر: (۱) بہار کوٹی

پنجاب: (۱) ڈاکٹر عاشق حسین صاحب بٹالوی ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

کلکتہ: (۱) سید حسینی صاحب آرٹسٹ

(۲) عبدالرحمٰن صدیقی ایم۔ ایل۔ اے کلکتہ

ایران: (۱) آقا سید محمد حجازی صاحب نمایندۂ فرہنگستان ایران۔

ہماری زبان

انجمنِ ترقیِ اُردو (ہند) کا پندرہ روزہ اخبار

ہر مہینے کی پہلی اور سولھویں تاریخ کو شائع ہوتا ہی
چندہ سالانہ ایک رُپیہ فی پرچہ ایک آنہ

اُردو

انجمنِ ترقیِ اُردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہی
اس میں ادب اور زبان کے ہر پہلو پر بحث کی جاتی ہی۔ تنقیدی اور محققانہ مضامین خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ اُردو میں جو کتابیں شائع ہوتی ہیں، ان پر تبصرہ اس رسالے کی ایک خصوصیت ہی۔ اس کا حجم ڈیڑھ سو صفحات سے زیادہ ہوتا ہی۔ قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملاکر سات رُپے سکۂ انگریزی (آٹھ رُپے سکۂ عثمانیہ) نمونے کی قیمت ایک رُپیہ بارہ آنے (دو رُپے سکۂ عثمانیہ)

رسالۂ سائنس

انجمنِ ترقیِ اُردو (ہند) کا ماہانہ رسالہ

(ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد سے شائع ہوتا ہی)
اس کا مقصد یہ ہی کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اُردو دانوں میں مقبول کیا جائے۔ دنیا میں سائنس کے متعلق جو جدید انکشافات وقتاً فوقتاً ہوتے ہیں یا بحثیں یا ایجادیں ہو رہی ہیں ان کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا جاتا ہی اور ان تمام مسائل کو حتی الامکان صاف اور سلیس زبان میں ادا کرنے کی کوشش کی جاتی ہی۔ اس سے اُردو زبان کی ترقی اور اہلِ وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہی۔ رسالے میں متعدد بلاک بھی شائع ہوتے ہیں۔
قیمت سالانہ صرف پانچ رُپے سکۂ انگریزی (چھ رُپے سکۂ عثمانیہ)
خط وکتابت کا پتا:- معتمد مجلس ادارت رسالۂ سائنس، جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد (دکن)

انجمنِ ترقیِ اُردو (ہند) دہلی